سلسلہ مطبوعات سرسید صدی

سرسید کا آئینہ خانۂ افکار

مقالات، خطبات، مکتوبات اور منظومات کا انتخاب

ترتیب و انتخاب

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

ڈائرکٹر مرکز مطالعہ سیرت،

سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، کراچی

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار۔ کراچی

Sir Syed ka Aina-e-Khana-e-Afkar
by
Syed Abul Khair Kashfi

ISBN 969-441-047-9

پیشکش و اہتمام
طارق رحمٰن فضلی
اشاعت اول: 1998ء

ناشر و طابع
فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار۔ کراچی

تقسیم کار
فضلی بک سپر مارکیٹ
۴ ماما پارسی بلڈنگ اردو بازار کراچی

Phones: 2629720-5 Fax: 9221-2633887
Email: fazlee@cyber.net.pk

علی گڑھ کی روایات کے امین
علی گڑھ کی ادبی تحریک کے ایک نمائندے
اور ماہنامہ "تہذیب" کے مدیر اوّل
پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم کے نام
جو اپنے دوستوں اور شاگردوں کے لئے زندہ ہیں

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

کتاب نما

مقالات و مضامین و شعر

اللہ، رسول، کتاب اور سرسید

مذہب، شریعت اور دین

شخصیات

تاریخی آثار

زبان و ادب

خطبات، تقاریر

مناجات اور دین

تاریخ، سیاست اور معاشرہ

تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت

مسلمانوں کی تعلیم اور طلبہ سے خطاب

سرسید اسٹیج پر

سفرنامہ

مکتوبات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۂ کتاب

1998ء سرسید احمد خاں کی وفات صدی کا سال ہے۔ 27 مارچ 1898ء کو جدید مسلم ہند کا بانی ہم سے رخصت ہوا۔ وہ جدید مسلم ہند کا موسس بھی تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ غلام علی اور شاہ اسماعیل شہید کی روایتوں کا امین اور وارث بھی تھا۔ سرسید کی ذات قدیم وجدید کا سنگم تھی۔ ایک طرف وہ ماضی کے اس علم کے نگہبان تھے جو ہماری شناخت ہے اور دوسری طرف وہ نئے علوم وفنون کو مسلمانوں من عام کرنا چاہتے تھے۔

سرسید احمد خاں مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ انہیں مسلمانوں کی علمی روایات بہت عزیز تھیں۔ وہ ہمیں یورپ پر اسلام کے احسان کی کہانی سناتے ہیں، وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے کس طرح مختلف قوموں کے علوم وفنون کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کرایا، کس طرح ان علوم کو ترقی دی۔ سرسید نے بزرگوں کی ایسی روایت کو مستحکم کرنے کے لئے 1864ء میں سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی، بہت سی کتابوں کا ترجمہ کرایا، باقاعدہ لکچروں اور سائنسی تجربوں کا اہتمام کیا۔

اسی طرح نئے معاشرتی اور سیاسی تصورات کو اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں عام کیا۔

اپنے کئی اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ اپنی آواز دور دور تک پہنچائی۔ ان رسالوں میں تہذیب الاخلاق کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

سرسید احمد خاں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ آثار الصنادید کے دور میں ان کا طرز تحریر روایتی اور آرائشی تھا۔ جب وہ ایک مصلح کے طور پر آگے بڑھے تو انداز بیان آسان ہوگیا، اور ان کی باتیں لوگوں کے دلوں میں اترنے لگیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان اور سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی 1998ء کو سرسید سال کے طور پر منارہی ہیں۔ مارچ میں سرسید بین الاقوامی سیمینار، مباحثے، کھیل اور مشاعرے کا انعقاد ہورہا ہے۔ سرسید کے یوم وفات پر 27 مارچ کو سرسید یونیورسٹی کا پہلا جلسۂ تقسیم اسناد ہورہا ہے۔

ان کاموں کے علاوہ ہم سرسید کی زندگی، کارناموں اور ان کے رفقا کے بارے میں کئی کتابیں شائع کررہے ہیں۔ ان کتابوں سے پڑھنے والوں کو تاریخی پس منظر میں سرسید کے کاموں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید ابو الخیر کشفی نے ہماری فرمائش پر سرسید احمد خاں کی تحریروں کا ایک انتخاب

ترتیب دیا ہے۔ اس انتخاب میں سرسید کے مضامین بھی ہیں، تقریریں بھی، خطوط بھی اور شاعری بھی۔ میرے علم کی حد تک یہ انتخاب اپنی نوعیت کا پہلا انتخاب ہے۔ کشفی صاحب نے کوشش کی ہے کہ سرسید احمد خاں کے افکار اور خیالات کا ہر گوشہ قارئین کے سامنے آسکے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب آج کے پڑھنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

ہم سرسید البم، علی گڑھ کالج، مسلم یونیورسٹی کی تاریخیں شائع کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ سرسید، ان کے رفقا اور علی گڑھ تحریک پر مضامین کے انتخابات بھی شائع کر رہے ہیں۔ میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور ۔

یہ انتہا نہیں، آغازِ کارِ مرداں ہے

زیڈ اے نظامی
چانسلر، سرسید یونیورسٹی آف انجینرنگ اینڈ ٹکنالوجی
صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان، کراچی

کچھ اس انتخاب کے بارے میں

بیسوی صدی کی ہر مسلمان نسل سرسید احمد خاں کے سائے میں پلی بڑھی ہے، عقل و شعور سے بہرہ مند ہوئی ہے، سرسید کی فکر کی روشنی میں اس نے اپنے مستقبل اور اجتماعی وجود کو سمجھا ہے اور اپنے مقاصد کا تعین کیا ہے، خواہ یہ مقاصد سید کے مقاصد سے کچھ حد تک یا بڑی حد تک مختلف رہے ہوں

اس بیان میں مبالغہ کی کوئی گنجائش اور پہلو نہیں ہے، بالخصوص پیراگراف کے آخری فقرے کے پیش نظر۔ علی گڑھ تحریک کے بعد کئی ملی تحریکیں وجود میں آئیں جنھوں نے مسلمانوں کے درد کا درماں بنانا چاہا۔ یہ سب تحریکیں علی گڑھ تحریک کی توسیعی شکلیں ہیں۔ کہیں انہیں مقاصد کو آگے بڑھایا گیا، کہیں ان پہلوؤں پر زور دیا گیا جنہیں اپنے دور کے حالات کی وجہ سے سرسید عملی طور پر اپنا نہ سکے۔ ندوۃ العلماء، جامعۂ ملیہ، مسلم لیگ، تحریک خلافت، جامعۂ عثمانیہ ___ یہ سب سرسید کے وہ پہلو ہیں جو بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر وجود میں آئے۔ ہمارے بیشتر دینی مدارس بھی مدرسۃ العلوم کے مقاصد کو دوسرے انداز سے تقویت دینے کے لئے قائم کئے گئے۔ یہ بنیادی پیغام سرسید ہی کا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان کے تعلیمی ادارے لازم ہیں اور سرکاری اسکول اور سرکاری تعلیمی ادارے مسلمانوں کی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ ہمارا مسئلہ محض جدید علوم، سائنس اور ٹکنالوجی کا حصول ہی نہیں، بلکہ مسلمان رہتے ہوئے یہ سب کچھ حاصل کرنا ہے اور یوں کہ اسلام کی تخلیقی اور تہذیبی قوت ہماری شیرازہ بندی کرے

یہ وہ عظیم ذہنی انقلاب سرسید کی فکر اور ان کی تحریر سے پیدا ہوا۔ سرسید کی ذات سے دو نکتے حل اور شفاف ہو کر سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ جہانِ تازہ افکارِ تازہ سے پیدا ہوتا ہے، اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ عہد ساز انسان تقلید کے اندھیروں میں اپنی ذات کو روشن کر کے تخلیق کے سارے مرحلے طے کرلیتا ہے۔ ان دونوں نکتوں کو اقبال نے دو شعروں میں سمو دیا ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا، تخلیق

سرسید کی فکر اور قلم سے ہمارے درمیان علوم کے نئے آفاق پیدا ہوئے، اور اردو زبان

میں ایک ہمہ گیر ادب پیدا ہوا جس میں جذبات کے رنگ بھی تھے، فکر دقیق بھی تھی، ادبی اسلوب کا تنوع بھی تھا، بلکہ یہ کہنا مناسب تر ہو گا کہ ادبی اسالیب کی ایک دھنک ہماری زبان کے آسمان پر نظر آئی۔ سرسید نے جو عملی کام یا وہ دنیا کے سامنے ہے، مگر بہت کم لوگوں کو ان کی تحریروں کے حجم اور پھیلاؤ کا اندازہ ہے۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین ہزاروں صفحات پر محیط ہیں اور پھر ان کی مستقل کتابیں آثار الصنادید، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن، رسالہ اسباب بغاوت ہند اور کئی بہت سے رسالے۔

چھٹی ساتویں جماعتوں کے نصابوں سے آگے تک سرسید سے ہر جگہ واسطہ پڑا اور اسکولوں اور کالجوں کی حد تک سرسید کے چند مضامین ہی دہرائے جاتے رہے "خوشامد"، "بحث و تکرار"، "امید کی خوشی"، "سرگزشت آدم" وغیرہ۔ اختیاری اردو میں "غلامی"، "تعصب" اور ایسے ہی چند مضامین اور شامل کر لئے جاتے۔ طالب علم کو یہ احساس تو ہو جاتا کہ سرسید کے لکھنے کا اسلوب ان کے موضوع کے مطابق بدل جاتا ہے۔ وہ ہمیں سوچنے کے لئے نکات دیتے ہیں اور ان کی تحریریں ہمیں ذہنی اور ادبی مسرت بھی عطا کرتی ہیں، لیکن یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ سرسید نے زندگی کے کتنے مسائل پر کس گہرائی میں جا کر غور کیا ہے۔

اپنی رسمی طالب علمی کے اختتام پر میں نے مضامین سرسید کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا، لیکن وہ بھی ان کے معروف مضامین پر مشتمل تھا۔ اب سرسید وفات صدی کے موقع پر، وفات صدی کمیٹی نے سرسید کے انتخاب کا فریضہ مجھے سونپا اور میں نے فرط شوق میں اس بار امانت کو اٹھایا۔ شاید یہ کام میں پورا نہ کر سکتا اگر جناب ظل احمد نظامی نے بھرپور تعاون نہ کیا ہوتا۔ بھائی ذاکر علی خاں کی ہمت افزائی، محض روایتی نہ تھی، میرے لئے نشاط انگیز بھی تھی۔

یہ سرسید کی تحریر، اسلوب اور اثرات پر مفصل گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ سرسید کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے طویل تر انتخاب کا خاکہ بنالیا ہے۔ وہ انتخاب تین جلدوں پر مشتمل ہو گا۔ پیش نظر انتخاب کا مقصد سرسید کی وسعت و جامعیت، ان کے موضوع کے پھیلاؤ، ان کے ذہن کے کام کرنے کے طریقوں اور تجزیہ کی صلاحیتوں کو پیش کرنا ہے۔ یہ انتخاب صرف ادبی نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے ورنہ اس میں "آدم کی سرگزشت" اور "امید کی خوشی" یہ دونوں مضامین ضرور شامل ہوتے۔ میں نے کوشش یہ کی ہے کہ زندگی کے اہم مسائل پر سرسید کی فکر قاری کے سامنے آجائے۔ وہ قاری جس کے پاس بہت وقت نہیں ہے مگر جو تاریخ کے تناظر کا شعور رکھتا ہے۔ اور قیام پاکستان تک قافلۂ ملت کے سفر سے کسی حد تک آشنا ہے۔ وہ قاری جو سرسید کی آمد کو ایک حادثہ نہیں سمجھتا، جس کے نزدیک سرسید انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کو اپنا مقصد نہیں جانتے تھے بلکہ جن کی زندگی کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان، مسلمان بن کر آنے والے

زمانے کی امامت کرے۔

یہ شاید پہلا انتخاب ہے جس میں سرسید کے مضامین و مقالات' تقاریر' مکتوبات اور شاعری سب کو شامل کیا گیا ہے۔ ان سب کے جداگانہ حصے انتخاب میں موجود ہیں۔ چند اور گفتنی باتیں انتصار سے عرض کرتا ہوں۔

۱۔ سرسید جیسے بلا کے لکھنے والے تھے اسی طرح بلا کے مقرر بھی تھے۔ اکثر نوٹا ور یاد داشتوں کے بغیر تقریر کرتے۔ کبھی کبھی وہ لکھی ہوئی تقاریر جلسوں میں پڑھتے۔ ایسی تقریروں کی مقالات و مضامین کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

۲۔ بیشتر مقالات و تقاریر کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اور اُنہیں ٹکڑوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں سرسید کے بنیادی خیالات شامل ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہے تین نقطوں ... کے ذریعہ اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہاں سے عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ بیشتر مضامین کے عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور کہیں کہیں مضمون کی وضاحت کے لئے ایک ہی مضمون کو دو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۳۔ اس انتخاب کی ایک غرض فکر سید کی مختلف جہات اور اطراف و جوانب کا احاطہ ہے۔ مذہب' سیاست' تاریخ' تعلیم' تعلیمی ادارے' آثار قدیمہ' شخصیات' اور "تہذیب الاخلاق" سے متعلق سرسید کی تحریروں کے اقتباسات اس انتخاب میں شامل نہیں کئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کو مرتب کیا جا رہا ہے' اور تہذیب الاخلاق کے بارے میں سرسید کی نگارشات کو ہم نے سرسید سے متعلق اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔

۴۔ اس انتخاب میں' برطانوی حکومت کی نوکر شاہی کے بارے میں سرسید کی تیز و تند طنزیہ تحریروں کو نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔' "ہندوستانیوں کا خون" ' "کلکتہ میں ایک صاحب" کا بھنگی سے مقدمہ' "جوتے کا مقدمہ" ' "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" --- ان مضامین سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اگر اسباب بغاوت ہند میں' سرسید نے کمپنی بہادر کی حکومت پر شدید تنقید کی ہے تو انہوں نے برطانوی حکومت کے اہل کاروں کے ظلم' تعصب اور عدل سے انحراف کو بھی بڑی غیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سرسید کو انگریز پسند کہنے کے لئے بے انصافی کے ساتھ ساتھ جہل کی ضرورت بھی ہے۔ یہ وہ مرد جلیل تھا جو اپنے افسران بالا سے اجازت لئے بغیر دربار بنارس سے رخصت ہو گیا کیونکہ وہاں انگریز اور ہندوستانی حکام کی نشستوں کے سلسلہ میں تفریق برتی گئی تھی

ان مضامین پر تنقید اور تبصرے سے ان کی تاریخی اہمیت اور اسلوب کی دل آویزی کو اجاگر کیا جا سکتا تھا' لیکن یہ کام ہم نے اپنے قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ انشاء اللہ جب یہ

انتخاب تین جلدوں میں پیش کیا جائے گا تو نقد و نظر کا حصہ بھی شامل کر دیا جائے گا۔

۵۔ مذہبی مضامین کو اس انتخاب میں مناسب نمائندگی دی گئی ہے مگر نزاعی مسائل و معاملات سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ ایسے مباحث ویسے بھی اپنی افادیت کھو چکے ہیں اور سرسید کے بعض خیالات اور آرا کی غلطی پر آج اپنے پرائے سب ہی متفق ہیں، لیکن سرسید کی دینی غیرت اور حمیت اور سیاسی و معاشرتی معاملات میں سرسید نے اسلامی فکر کی جس طرح ترجمانی کی ہے اس نے ان کے بعد کے علماء اور اہل قلم کو متاثر کیا ہے۔ اللہ، رسول اور کتاب پر سرسید کے معتقدات پر اعتراض کرنے والے مجموعی طور پر اپنے وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ وہ مرد مومن تھا اور اللہ سے اپنی آزادی کو اپنے دین اور اپنے خون کا حصہ قرار دیتا ہے۔

آخر میں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ سرسید کے مقالات، تقاریر اور خطوط کے مختلف مجموعے ہمارے سامنے تھے، مگر مجموعی طور پر ہم نے محمد اسماعیل پانی پتی کے مرتبہ مجموعوں پر اپنے انتخاب کی بنیاد رکھی ہے

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس انتخاب کے ذریعہ سے سرسید کے فکر کی تفہیم سہل تر ہو جائے۔

۱۲ مارچ ۱۹۹۸ء

سید محمد ابوالخیر کشفی

مقالات

مضامین

شعر

مناجات

الٰہی میں ہوں بندہ بس گنہ گار
کہ بھاگا در سے تیرے دن میں سو بار
الٰہی در بدر بھٹکا پھرا میں
نہ آسودہ ہوا ہرگز ذرا میں
الٰہی نفس و شیطاں نے ستایا
نہ جانا تھا جہاں رستہ بتایا
الٰہی ہر طرف سے پھر پھرا کر
پڑا ہوں تیرے دروازے پہ آکر
الٰہی تو شہنشاہ جہاں ہے
الٰہی دوسرا تجھ سا کہاں ہے
نہیں قادر الٰہی کوئی تجھ سا
نہیں عاجز الٰہی کوئی مجھ سا
الٰہی تو غنی میں بے نوا ہوں
الٰہی شاہ تو ہے میں گدا ہوں
الٰہی تو غفور اور میں گنہ گار
الٰہی تو کریم اور میں گرفتار
الٰہی تو قوی اور ناتواں میں
خداوندا کہاں تو اور کہاں میں
کیا میں نے تھا جو مجھ کو سزاوار
تو اب وہ کر جو ہے تجھ کو سزاوار
الٰہی بخش دے اپنے کرم سے
چھڑا دے دین اور دنیا کے غم سے
الٰہی آسرا رکھتا ہوں تیرا
تو کر دے خاتمہ باخیر میرا

الٰہی میں سبھی محتاج تیرے
الٰہی بخش دے ماں باپ میرے
الٰہی ترک دنیا کا کروں میں
تری ہی یاد میں آخر مروں میں
نہ رکھوں کچھ غرض شاہ و گدا سے
جو کچھ چاہوں سو چاہوں تجھ خدا سے
الٰہی سینۂ بریاں عطا کر
الٰہی دیدۂ گریاں عطا کر
الٰہی عشق میں احمد کے رکھ چور
ہے بیمارِ محبت اس کا مغفور
الٰہی دردِ عشق مصطفیٰؐ دے
پھر اس کے وصل کی مجھ کو دوا دے
الٰہی مجھ کو کر خاک مدینہ
لگا دے گھاٹ سے میرا سفینہ
الٰہی فبغنی من کسل فین
بجا المصطفیٰ مولیٰ الجمیع
وھب لی فی مدینتہ قرارا"
بایمان و دفن بالبقیع

مُناجات

"اے خدا! تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے۔ اے خدا! اصلی بادشاہت اور حقیقی سلطنت تجھ ہی کو سزاوار ہے۔ اے خدا! مالک الملک! تو ہی ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے، ذلت دیتا ہے۔ اے خدا! سارے عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل تیرے ہاتھ میں ہیں۔ جس طرف تو چاہتا ہے ان کو پھیرتا ہے اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت اور رحمت سے خالی نہیں۔ تیرے کام میں کسی کو چون و چرا کی قدرت نہیں۔ اے خدا! ہم تیرے عاجز بندے سراسر تیرے گنہگار ہیں۔ اے خدا! ہماری شامت اعمال نے ہم کو گناہ کے دریا میں سر تک ڈبو دیا ہے۔ اے خدا! ہم تیرے ہر وقت تقصیر وار ہیں۔ جب تک تیری مدد نہ ہو ایک دم گناہ سے پاک نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخشنے والا نہیں۔ ہم نہایت عاجزی اور کمال انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی حضرت محمد رسول ﷺ کے وسیلے سے تجھ سے چاہتے ہیں۔ اے خدا! تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت لے گئی ہے۔ اپنی رحمت کاملہ سے ہمارے گناہ معاف کر۔ اے خدا! جس طرح تیری حکمت سے میلا کپڑا میل سے پاک ہوا ہے، اسی طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی ناپاکی سے پاک کر۔ اے خدا! اپنی بے انتہا رحمت سے ہمارے دل کو تمام برائیوں اور ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں، صاف کر۔ اے خدا! ہمارے دل کے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدس کی تائید سے قوی کر۔ تیرے سوا ہمارا حقیقی ماوا اور اصلی ملجا اور کوئی نہیں، آمین!

الٰہی! ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔ الٰہی ہماری شامت اعمال کی کچھ انتہا نہ رہی تھی۔ اگرچہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی سزا اور جزا کا ایک دن بیشک آنے والا ہے جس کا تو نے اپنے سچے نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے، اور اس دن تیری رحمت اور تیرے فضل کے سوا کسی کا چھٹکارا نہیں، کیونکہ تیرے آگے سب گنہگار ہیں۔ مگر ان پچھلے دو برسوں میں جو تیری نگاہ قہر آلود تیرے عاجز بندوں کی طرف ہوئی، وہ بیشک ہماری شامت اعمال کا ظاہری نتیجہ تھا۔ الٰہی! ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ الٰہی! ہم اپنے گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتے

ہیں۔ الٰہی! تو ہمارے گناہ سب معاف کر۔ آمین!

الٰہی! پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گزرا کہ انسان اور حیوان اور تمام چرند و پرند' بلکہ شجرو حجر کو بھی چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص بھی اپنی جان و مال اور آبرو پر مطمئن نہ تھا۔ ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان کو گویا الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الٰہی! تو نے اپنے فضل و کرم سے ان تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ الٰہی تو نے پھر اپنے عاجز بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسائش ان بدبخت برسوں سے پہلے تو نے اپنے بندوں کو دی تھی' پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے بندوں کو نصیب کی۔ الٰہی! تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکرادا کرتے ہیں۔ الٰہی! تو ہمارے اس شکرانے کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے' اپنے فضل و کرم سے قبول کر' آمین!

(حیات جاوید)

یہ مناجات سرسید احمد خاں نے 28 جولائی 1859ء کو مراد آباد میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں پڑھی۔ حالی کے الفاظ میں "اس مناجات کے الفاظ سرسید کے دل کی اصلی حالت کو نہایت واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں"

مرتب

پردرد اور عاجزانہ دعا

اے خدا! اے خدا! بے شک خدا تو ہی ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔ اے خدا! اے خدا! بے شک تو ہی ازلی ہے اور تو ہی ابدی ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔ تو ہی ہمارا خالق ہے اور تو ہی ہمارا مالک۔ تو ہی ہمارا معبود ہے اور تو ہی ہمارا مسجود۔ تو ہی ہماری دعا ہے اور تو ہی ہمارا مدعا۔ تو ہی ہمارا مقصد ہے اور تو ہی ہمارا مقصود۔ الٰہی! ہم تجھی کو چاہتے ہیں اور تجھی سے چاہتے ہیں۔ الٰہی! ہم تجھی کو مانگتے ہیں اور تجھی سے مانگتے ہیں۔ اے میرے پیارے اللہ! ہمارا دل' ہماری جان' ہماری روح تیری ہی ہے اور تیرے ہی لئے ہے۔ اے قادر مطلق خدا! یہ تمام قویٰ جو ہم میں ہیں' تجھی سے ہیں اور تیرے ہی لئے ہیں۔ پس اپنی چیز کو اپنی ہی مرضی کے تابع رکھ۔

الٰہی! ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں۔ ہماری شامت اعمال نے ہم کو گناہوں کے کالے دریا میں ڈبو دیا ہے۔ الٰہی! ہم نے تیری تقصیر کی ہے اور تیری امانت میں خیانت کی ہے۔ جو چیزیں تو نے ہم کو جن کاموں کے لئے دی تھیں ان سے ہم نے وہ کام نہیں لیا۔ الٰہی! ہمارے نفسِ امارہ نے ہم کو بہکایا اور گناہ میں ڈالا۔ الٰہی! ہم نے تیری نافرمانی کی اور تجھ سے یکتا خدا کی حکم عدولی کی۔ ہم بال بال گنہگار ہیں۔ گناہوں کے عمیق دریا میں غرق ہیں' مگر تیرے ہی سہارے کی امید ہے۔ پس اے ہمارے غفور الرحیم خدا! ہماری دستگیری کر اور ہم کو گناہوں سے نکال اور آبِ رحمت سے ہمارے گناہوں کو دھو اور ہمارے دل کو برف سے زیادہ سفید اور اپنی ذات کے نور سے سورج سے بھی زیادہ چمکیلا کر۔

اے خدا! تو بے شک بے نیاز ہے۔ تیری بے نیازی ہم کو تسلیم ہے' مگر کیا تو ہم سے بھی بے نیاز ہے۔ گیرم کہ غمت نیست غم ما ھینست۔ نہیں نہیں حاشا وکلا تو ہمارے ماں باپ سے بھی زیادہ ہمارا غم خوار ہے۔ جیسے کہ ہم تجھ سے بے نیاز نہیں ہیں' ویسا ہی تو بھی ہم سے بے نیاز نہیں۔ اے خدا! اے خدا! ہمارا اور تیرا یہ رشتہ کہ تو ہمارا خدا ہے اور ہم تیرے بندے اور تو ہمارا خالق ہے اور ہم تیری مخلوق' کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اے ہمارے عظیم الشان خدا! اگر تجھ کو خدائے ذوالجلال' وحدہٗ لاشریک ہونے کی عزت حاصل ہے تو ہم کو بھی تیرے بندے ہونے پر

بہت ہی کچھ فخر ہے۔ پس اپنے جلال کو دیکھ اور اپنے بندوں کی دستگیری کر۔

الٰہی! ہمارا دل اور ہماری جان محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین ورحمتہ للعالمین پر فدا ہو جن کو تو نے ہماری ہدایت کے لئے بھیجا اور جن کی ہدایت سے ہم نے تجھ کو جانا۔ پس تجھ سے ہم نے رسول اللہ کو پایا اور محمد رسول اللہ سے تجھ کو۔

محمد از تو میخواہم خدا را
خدایا از تو خواہم مصطفیٰ را

پس اے خدا تو ہمیشہ ہم کو ان کی راہ پر رکھ اور ان پر اور ان کی آل و اصحاب پر اپنی رحمت نازل کر۔ اللھم صل علیٰ محمدٍ و علیٰ آل محمدٍ کما صلیتَ علیٰ ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم انک حمیدٌ مجید۔

(یہ دعا سر سید احمد خاں نے 27 فروری 1872ء
کو ایک جلسہ میں پڑھی)
تہذیب الاخلاق، 10 محرم 1289ھ

حدیث دل

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارام
مسیحا رشک می آروز درمانے کہ من دارم

زکفر من چہ می خواہی، ز ایمانم چہ می پُرسی
ہماں یک جرعۂ عشق ست ایمانے کہ من دارم

خدا دارم، دل بریاں ز عشق مصطفیؐ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خوانم
ہمہ گفتار معشوق ست قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد باہمہ شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

ز برہاں تابہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ
نہ دارد ہیچ واعظ، ہم چوبرہانے کہ من دارم

ذاتِ باری جل جلالہٗ و اعظم شانہٗ

اسلام نے ہم کو ذات باری کی نسبت یہ بتایا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ واحد ازلی و ابدی ہے۔ وہ موجود ہے' اس لیے کہ واجب الوجود ہے' مگر بغیر صورت کے اور بغیر مکان کے۔ خود اس نے اپنے آپ کو اپنی صفات میں ظاہر کیا ہے' یعنی اس کی صفات عین اس کی ذات ہیں۔ نہ کوئی اس کی مثل ہے نہ مشابہ' نہ کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کوئی مقابل' نہ اس کا کوئی باپ ہے نہ اس کا کوئی بیٹا' نہ چھوا جاتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے' نہ ہماری عقل میں آسکتا ہے' نہ خیال میں سما سکتا ہے' مگر ہمارے یقین یا ہمارے مخفی خیالات میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

نہج البلاغہ میں جناب علی مرتضٰی علیہ السلام کا یہ قول لکھا ہے: اول الدین معرفتہٗ و کمال معرفتہ التصدیق بہ و کمال التصدیق بہ توحیدہ و کمال توحیدہ الاخلاص لہٗ و کمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ۔

مگر جیسا کہ مسٹر گبن نے لکھا ہے ایک فلسفی یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب ہم اس نامعلوم جوہر کو جو ایک خیال سے جو زمان یا مکان یا مشابہت یا حرکت یا ارادہ یا حس یا خیال سے متعلق ہو مُنزہ کر دیں تو ہمارے تصور یا فہم کے لیے کیا چیز باقی رہ جاتی ہے۔

مگر حضرت مرتضٰی کے قول پر غور کرنے سے اس کا جواب مل سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی سیڑھی اسلام کی خدا کا جاننا ہے۔ پھر اس وحدت اور واجب الوجود ہونے پر یقین کرنا ہے جو عقل اور نقل دونوں سے علیٰ حسبِ استعدادِ افراد الناس ثابت ہوتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ خلوص پیدا کرنا ہے اور خلوص کا کمال ذات باری سے صفات کا نفی کرنا ہے۔

جب انسان اس کے موجود ہونے پر یقین کرتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ کیسا وہ کمال والا ہے جس نے ایک اعجوبہ اور دلکش طرز پر جس سے زیادہ عمدہ نہیں ہو سکتی دنیا کو رچا ہے۔ پھر وہ اپنے آپ پر غور کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس پتلے کو اس نے کس قدر نعمتیں عنایت کی ہیں اور اس کی ترکیب جسمانی میں کیسی کیسی حکمتیں رکھی ہیں اور اس کے دماغ کو کیسی کیسی اعلیٰ قوتیں عنایت کی ہیں تو اس کی محبت اور اس کے ساتھ اخلاص پیدا ہوتا ہے اور جس قدر اس غور میں

ترقی ہوتی جاوے اور وہ دقائق اور لطائف جو خود نفس انسانی میں ہیں زیادہ کھلتے جاویں اور موجودات عالم کے عجائبات اس کو معلوم ہوتے جاویں' اسی قدر اخلاص ترقی کرتا جاتا ہے اور کمال توحیدہ الاخلاص لہٗ کے درجے پر پہنچ جاتا ہے اور اس واجب الوجود کو جامعِ جمیع صفاتِ کمال قرار دیتا ہے۔

مگر جب یہ اخلاص درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے جن صفات کمال کا جامع اس ذات پاک کو قرار دیا ہے بلاشبہ وہ صفتیں تو اس میں ہیں مگر میں نے جو ان صفتوں کی حقیقت سمجھی ہے وہ تو ممکنات سے ماخوذ کی ہے۔ وہ صفتیں تو اس واجب الوجود کی صفات ہو نہیں سکتیں اور اس لیے وہ ان سب کو ذات باری سے نفی کرتا ہے اور کہتا ہے لیس ھو عالم لیس ھو حی لیس ھو قادر و لیس سو کذا و کذا کما انا نعلم حقیقتھا۔ پس اس طرح نفی کرتے کرتے اس کے تصور و فہم کے لیے ایک وجود جو واجب الوجود ہے اور جو مجمع جمیع صفات کمال ہے باقی رہ جاتا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کی صفات ایسی اعلیٰ اور ارفع ہیں کہ انسان کے خیال کو اس پر حاوی ہونے کی قدرت نہیں وھو ربنا و ربکم و الھنا و الٰھکم و انا اعبدہ فاعبدو ھٰذا صراط مستقیم۔

تہذیب الاخلاق' یکم محرم / 1312ھ

م 7 جولائی 1894ء

نمیدانم نمیدانم نمیدانم نمیدانم

کدام چیز نمیدانی - لاعِلم لنا اِلاّ ما علّمتنا انک انت العلیم الحکیم

اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا نے انسان کو عقل و معرفت عطا کی ہے' اگر یہ نہ دی ہوتی تو وہ مامور بھی نہ ہوتا۔ مگر وہ جو دی ہے نامحدود نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں چل سکتی۔ مگر وہ بھی عقل ہی ہم کو بتاتی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو اس کی حد بھی معلوم نہ ہوتی۔

جو باتیں ہماری عقل کی حد سے باہر ہیں خدا بھی تو ان کو صاف صاف نہیں بتاتا' بلکہ مثالوں میں سمجھاتا ہے اور فرماتا ہے و یضرب اللہُ الا مثال لِلناس لعلھم یتذکرون۔ پھر کوئی شخص' گو کہ والراسخون فی العلم ہی کیوں نہ ہو اس حد سے اگے نہیں بڑھ سکتے۔ پھر جس طرح اس حد کا توڑنا فطری گناہ ہے' اسی طرح اس حد کے اندر اس کا کام میں نہ لانا فطری گناہ ہے۔

عالم شہادت جس کو ہم دیکھتے ہیں اس کی بہت باتیں عقل کی حد سے باہر ہیں' کیونکہ اس میں ہم کتنی ہی عقل کو کام میں لاویں بجز موجود کے اور کچھ نہیں جان سکتے۔ مثلاً" ہم نے ایک قسم کی ہوا کو پایا ہے اور اس کا نام آکسیجن رکھا ہے اور دوسری قسم کی ہوا کو پایا ہے جس کا نام ھائیڈروجن رکھا ہے۔ اول تو اس کا جاننا کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کیا ہے' ہماری حدِ عقل سے خارج ہے اور پھر جب وہ دونوں ملتی ہیں تو پانی بن جاتا ہے۔ یہ تو ہم نے جانا کہ ان کے ملنے سے پانی بن گیا' مگر اس بات کا جاننا کہ کیوں پانی بن گیا ہماری عقل کی حد سے باہر ہے۔ علماء علوم طبعیہ' یعنی نیچرل سائنس جاننے والے تو یہیں تک ٹھہر جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو موجود ہے اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں پاتے۔ مگر علماء علم مذاہب اس سے آگے بڑھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ آکسیجن اور ھائیڈروجن کا پیدا کرنے والا اور ان میں ایسی تاثیر رکھنے والا کہ جب وہ ملیں تو پانی ہو جاوے کوئی ہے اور جس کو وہ خدا کہتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق شوال 1312ھ
4 مارچ 1895ء

قرآن مجید کی تفسیر کے اصول

پس سمجھو کہ تفسیر لکھنے میں میرے اصول کیا ہیں۔ اس کے بالا ستیعاب بیان کرنے کے لئے تو ایک رسالہ مستقل چاہئے مگر میں چند کو جو مقدم ہیں بتلاتا ہوں۔

پہلا اصول۔ یہ ہے کہ خدا سچا ہے اور قرآن مجید اس کا کلام اور بالکل سچ اور صحیح ہے۔ کوئی علم یعنی سچ اس کو جھٹلا نہیں سکتا' بلکہ اس کی سچائی پر زیادہ روشنی ڈالتا ہے۔

دوسرا اصول۔ یہ ہے کہ اب ہمارے سامنے دو چیزیں موجود ہیں (1) ورک آف گاڈ یعنی خدا کے کام (2) ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کا کلام یعنی قرآن مجید' اور ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتا۔ اگر مختلف ہو تو ورک آف گاڈ تو موجود ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا اور اس لئے ورڈ آف گاڈ جس کو کہا جاتا ہے اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے نعوذ باللہ منھا۔ اس لئے ضرور ہے کہ دونوں متحد ہوں۔

تیسرا اصول۔ ورک آف گاڈ یعنی قانون قدرت ایک عملی عہد خدا کا ہے اور وعدہ اور وعید یہ قولی معاہدہ ہے اور ان دونوں میں سے کوئی بھی خلاف نہیں ہو سکتا' لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اس کی تسلیم سے خدا کی قدرت مطلق میں نقصان آتا ہے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا خیال ہے' محض غلط اور وہم اور نا سمجھی ہے۔ اس رلاز کے سمجھانے کو چند سطریں کافی نہیں۔

چوتھا اصول۔ خواہ یہ تسلیم کرو کہ انسان مذہب' یعنی خدا کی عبادت کے لئے پیدا ہوا ہے' خواہ یہ کہو کہ مذہب انسان کے لئے بنایا گیا ہے' دونوں حالتوں میں ضرور ہے کہ انسان میں بہ نسبت دیگر حیوانات کے کوئی ایسی چیز ہو کہ وہ اس بار کے اٹھانے کا مُکلف ہو اور انسان میں وہ شے کیا ہے؟ عقل ہے' اس لئے ضرور ہے کہ جو مذہب اس کو دیا جاوے وہ عقل انسانی کے مافوق نہ ہو (مجھ کو افسوس ہے کہ تم ہرگز نہیں سمجھتے کہ عقل انسانی اور عقل شخصی میں کیا فرق ہے) اگر وہ عقل انسانی کے مافوق ہے تو انسان اس کا مُکلف نہیں ہو سکتا' بلکہ اس کی ایسی مثال ہو گی جیسے کہ بیل یا گدھے کو امرونہی کا مُکلف قرار دیا جاوے یا جونپور کا قاضی بنا دیا جاوے۔

مذہب اسلام اور خدا کا کلام ان تمام نقصانوں سے پاک ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ تم سمجھ لو اور سمجھ کر یقین کرو کہ جو کچھ خدا بتاتا ہے اور کہتا ہے وہ سچ ہے۔ اس سے زیادہ سچائی کیا ہو سکتی ہے جو بانیٔ اسلام کی زبان سے کہدینے کو خدا نے فرمایا۔ انما انا بشر مثلکم یوحی الّی انما الھکم الہٗ واحد۔ انما انا بشیر و نذیر۔ جان من' مذہب اسلام اور خدا کے کلام کو دیو پری کے قصے مت بناؤ ورنہ جو فوقیت اسلام کو دوسرے مذاہب باطلہ سے ہے وہ ساقط ہو جاتی ہے اور اسلام عقل انسانی کی رو سے قابل یقین نہیں رہتا۔

یہ اس خط کا اقتباس ہے جو 17 اگست 1892ء کو سرسید نے نواب محسن الملک کو لکھا۔ اس سے ان اصولوں کا علم ہوتا ہے جو سرسید نے اپنی تفسیر میں برتتے ہیں۔ محسن الملک کو اس باب میں سید صاحب سے جو اختلافات تھے انہوں نے انہیں جرات کے ساتھ اپنے خطوط میں قلم بند کیا ہے۔ اپنے مزاج کی سختی کے باوجود سرسید آزادی رائے کے عملاً" حامی تھے۔

مرتب

قرآنِ حکیم - وقت اور زمانے سے بالاتر

ہم اس مضمون کے ماحصل سے متفق ہیں مگر اس بات سے اختلاف کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے احکام قابل ترمیم یا تبدیل ہیں۔ قرآن مجید بطور قواعد کلیہ کے ایسے عمدہ اصول پر نازل ہوا ہے کہ کسی زمانے میں بھی اس کی ترمیم کی حاجت نہیں ہے۔

وراثت - علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

12 دسمبر 1882ء

○ قانون وراثت اسلام پر پایونیر (مشہور انگریزی اخبار PIONEER) میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا ترجمہ اردو اخبار نے چھاپا۔ سرسید نے اسی مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ مضمون لکھا

خطباتِ احمدیہ سے اقتباسات

اسلام دنیا کے لیے رحمت ہے

سر ولیم میور جو ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔ اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں جس کے لیے ہم مسلمانوں کو ان کا شکر کرنا چاہیے ارقام فرماتے ہیں کہ "ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے (یعنی مذہب اسلام نے) ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے عرب کے ملک جزیرہ نما پر چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہو گئی اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ایک خاص اور ہر ایک جگہ احاطہ کی ہوئی قدرت کا مسئلہ حضرت محمد کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے جیسے کہ خاص محمدؐ کے دل میں تھا۔ مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کے معنے ہیں یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا چاہیے۔ بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں۔ یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیے۔ غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت برتنی چاہیے۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیز گاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔"

سر ولیم کی اس تحریر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا بلکہ اس سچے مسئلہ وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے۔ جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پُر تاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ

خصلت اور سخت گناہ ہے۔

برادرانہ دینی محبت کا برتاؤ آپس میں مسلمانوں کے ایک خدا کے ماننے والے ہونے کی وجہ سے بتایا جو ایک قدرتی رشتہ دینی بھائی ہونے کا ہے، مگر انسانی محبت کا برتاؤ تمام انسانوں سے بلکہ ہر ایک سے جو جگر تر رکھتا ہو، برتنے کو فرمایا۔

غلاموں کی نسبت اگر صحیح تسلیم کیا جاوے تو اسلام نے غلامی کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہے اسیران جنگ کے سوا کوئی غلام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی زمانہ جاہلیت کی رسم کے موافق مگر قرآن نے ''اما منا بعد و اما فدا'' کہہ کر اس کو بھی نابود کر دیا۔ جو لوگ اسیران جنگ کو احسانا'' چھوڑ دیتے ہیں، نہایت اعلیٰ درجہ پاتے ہیں اور جو کچھ لے کر چھوڑتے ہیں وہ ان سے کم تر گنے جاتے ہیں۔ اس حکم کے پہلے سے جو لوگ غلام رکھتے تھے ان کی پرورش کا اسی طرح ان کو حکم دیا جس طرح کہ وہ آپ اپنی جان کی پرورش کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کی نسبت سر ولیم میور نے مذکورۂ بالا فقرہ میں اشارہ کیا ہے مگر اتنی بات اور زیادہ کرنی چاہیے تھی کہ مذہب اسلام نے قمار بازی کو منع کرنے اور ناشائستہ کلمات کے منہ سے نکالنے کی ممانعت سے، والدین کے ساتھ محبت اور تعظیم سے پیش آنے کی تاکید سے، ایک مناسب اندازہ سے خیرات دینے کی رغبت دلانے سے، لوگوں کو ان کی حاجت میں قرض حسنہ دینے سے۔ وعدہ کی وفا کرنے کی تاکید سے، جانوروں کے ساتھ رحم اور مہربانی برتنے کے حکم سے، انسانوں کے اخلاق اور ان کے حسن معاشرت میں بہت کچھ ترقی دی ہے۔

بعثت محمدیؐ کی بشارت

حضرت موسیٰ پیغمبر اور حضرت حبقوق نبی نے نبی عربی حجازی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مبعوث ہونے کی اس طرح بشارت دی ہے۔

(اس عبرانی عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے):

ویوم بھوامسینائی بباذ ارح مسعیر لا موھو فیع مھر باران وانامر بیوث فودش میمینوایش داث لاسو۔

الووۃ متیمان یابو وقادوش مھر پاران سلہ کسہ ممابابم ھودو نھلان مالثا ھا ارص۔

اردو ترجمہ

اور کہا خدا سینا سے نکلا اور سعیر سے چمکا اور فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں شریعت روشن ساتھ لشکر ملائکہ کے آیا (توریت کتاب، پنجم باب 3-32)

آئے گا اللہ جنوب سے اور قدوس فاران کے پہاڑ سے، آسمانوں کو جمال سے چھپا دیا، اس کی ستائش سے زمین بھر گئی (کتاب جبقوق، باب 3-3)

ان آیتوں میں جو کوہ فاران سے خدا کا ظاہر ہونا اور شریعت کا اس کے ہاتھ میں ہونا بیان ہوا وہ علانیہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کے مبعوث ہونے اور قرآن مجید کے نازل ہونے کی کہ وہی شریعت ہے، بشارت ہے۔

یہ بات عرب کے قدیم جغرافیہ سے اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق او رتسلیم سے اور توریت کے محاورات سے بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ مکہ معظمہ کے پہاڑوں کا نام فاران ہے۔ چنانچہ امر مذکورہ کے ثبوت کی کافی دلیلیں بیان کرتے ہیں۔

اکتوبر 1869ء کے کوارٹرلی ریویو میں اسلام پر ایک آرٹیکل چھپا ہے جو ایک بہت بڑے عالم یہودی زبان جاننے والے کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے صفحہ 299 میں لکھا ہے کہ سیفرنے ان خاص آیتوں کی جن میں سینا اور سمیر اور فاران کی بشارت مذکور ہے اس طرح پر تشریح کی ہے کہ "خدا سینا سے نکلا" یعنی عبرانی زبان میں شرع دی گئی (جس سے مراد توریت ہے) اور "سعیر سے چمکا" یعنی یونانی زبان میں بھی شریعت دی گئی جس سے سے مراد انجیل ہے اور مسلمان کُل عیسائیوں کو رومی کہتے تھے۔ اور "فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا اور اس کے ہاتھ میں شریعت روشن" یعنی عربی زبان میں شریعت دی گئی (جس سے مراد قرآن مجید ہے) پس اس عالم کے قول سے ثابت ہے کہ فاران وہی جگہ ہے جہاں سے مذہب اسلام ظاہر ہوا یعنی حجاز یا مکہ معظمہ۔

چند سطروں کے بعد اسی آرٹیکل کا لکھنے والا پھر لکھتا ہے کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سینا اور سعیر اکثر بجائے اسرائیل اور عیسیٰ کے مستعمل ہوتے ہیں اور ادوم بجائے روم کے اور فاران تو صاف عرب کے لیے مستعمل ہے۔ صرف اس میں شبہ ہے کہ مکہ کے گرد کے پہاڑوں کا یہ نام ہے یا نہیں" مگر ہم اس شبہ کو بھی مٹا دیں گے اور قدیم جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت کر دیں گے کہ مکہ کے گرد پہاڑ ہی فاران ہیں۔

توریت کتاب اول باب 21 آیت 20 میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ

اور حضرت اسماعیل کو اپنے پاس سے نکال دیا تو وہ دونوں بیر شبع کے بیابان میں پھرا کیے اور اسی باب کی اکیسویں آیت میں لکھا ہے کہ بیابان فاران میں ساکن ہوئے۔

قرآن مجید سے بھی حضرت اسماعیل کی سکونت بیابان میں معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت اسماعیل کے اس زمانہ کی سکونت کا ذکر ہے۔ جب کہ حضرت ابراہیم ان کے پاس آئے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر کر کے اسی کے پاس حضرت اسماعیل کی سکونت مستقل طور پر کردی تھی اور یہ بات توریت سے بھی پائی جاتی ہے کہ پہلے حضرت اسماعیل بیابان میں خانہ بدوش تھے پھر بیابان فاران میں سکونت اختیار کی۔

(خطبات احمدیہ سے اقتباس)

خدا، رسول اور قیامت کے متعلق سرسید کے عقائد

لندن سے واپس آنے کے بعد جب سرسید نے اپنا اصلاحی کام شروع کیا اور قوم کی زبون اور ابتر حالت کو بہتر بنانے کا ارادہ کیا اور علی گڑھ، میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کے قیام کا اعلان کیا، تو قوم نے اس مفید کام میں ان کی مدد کرنے کی بجائے ہر طرف سے ان پر نہایت زور شور کے ساتھ کفر کے فتوؤں کی بارش ہونے لگی اور مکہ معظمہ تک سے سرسید کے کفر کے فتوے منگوائے گئے۔ غریب سید کو کافر، ملحد، بے دین بنانے والے علمائے کرام نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور نہایت کوشش سے ہر جگہ کے مشہور علماء سے سرسید کے کفر پر مہریں لگوائیں۔ اسی سلسلے میں مومنین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیو بند کے پاس بھی پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ آپ بھی سرسید کے کفر کی تصدیق فرما دیجئے تاکہ کسی مسلمان کو اسے کافر سمجھنے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ (اس زمانہ میں کفر کے فتوؤں میں یہ دفعہ لازمی ہوتی تھی کہ جس شخص کے متعلق کفر کا فتویٰ دیا جا رہا ہے جو شخص اسے کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر ہے اور اس کی بیوی پر طلاق ہے)۔ خیر جب علمائے کرام نے اس یقین و اعتماد کے ساتھ سرسید کے کفر کا فتویٰ حضرت مولانا محمد قاسم کی خدمت میں پیش کیا کہ حضرت مولانا بلا چوں و چرا اور بلا تامل اس فتوے پر مہر تصدیق ثبت فرما دیں گے، کیوں کہ اس وقت یہ متفق علیہ مسئلہ تھا کہ: مصرع

سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

لیکن علمائے کرام کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب ان کی توقع اور امید کے بالکل برخلاف حضرت مولانا نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ ٹھہریے! پہلے میں ذاتی طور پر اس امر کی تحقیق تو کر لوں کہ سید احمد واقعی کافر ہے؟ یا لوگوں نے اسے "کافر" بنا دیا ہے؟

اس گفتگو کے بعد حضرت مولانا نے حسب ذیل سوالات لکھ کر سرسید کو بھیجے اور ان کو لکھا کہ ان کے مختصر جوابات لکھ کر بھیج دیں۔ یہ سوال اور ان کے جوابات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

(1) س: خدا کی نسبت آپ کا جو عقیدہ ہو وہ بہت مختصر طور پر چند لفظوں میں لکھ دیں۔

ج: خدا تعالیٰ ازلی' ابدی' مالک اور صانع تمام کائنات کا ہے۔

(2) س: حضرت نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق آپ کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟

ج: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(3) س: قیامت کی بابت آپ کے خیالات کیا ہیں؟ جواب مختصر ہو

ج: قیامت برحق ہے۔

سرسید کی طرف سے ہر سہ امور کے متعلق یہ جواب موصول ہونے پر حضرت مولانا نے علمائے کرام سے فرمایا ہے کہ "کیا تم ایسے شخص کے کفر پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے۔ جاؤ میں قیامت تک اس فتوے پر دستخط نہیں کروں گا۔"

(منقول از اخبار صدق جدید' لکھنؤ
7 اکتوبر 1960ء

مذہب انسان کا امرِ طبیعی ہے

انسان ہو یا حیوان جب ان میں کوئی ایسی چیز دیکھی جاتی ہے جو سب میں ہو تو کہتے ہیں کہ وہ اس میں امر طبیعی ہے۔ سانپ کا لہراتا ہوا' بچھو کا ڈنک مارتا ہوا چلنا' تمام سانپوں اور تمام بچھوؤں میں دیکھا جاتا ہے اور اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ان کا امر طبیعی ہے۔ تمام انسانوں کا سیدھا قد دیکھتے ہیں' دو پاؤں پر چلتا ہوا پاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کا یہ امر طبیعی ہے۔ اسی طرح اگر یہ بات ثابت ہو کہ تمام انسان کچھ نہ کچھ مذہب بھی رکھتے تھے تو ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذہب بھی انسان کا امر طبیعی ہے۔

انسان کے حالات کی اس وقت تک جس قدر تحقیقات ہوئی ہے اس سے پایا گیا ہے کہ جس جس جگہ اور جس جس زمانے میں انسان تھا وہ کچھ نہ کچھ مذہب بھی رکھتا تھا۔ وہ وحشی قومیں جو اب دنیا سے نیست و نابود ہو گئیں اور جن کی نشانیاں زمین میں دبی ہوئی نکلتی ہیں اور جیالوجی ان کے وجود کا ایک زمانہ بعید قرار دیتی ہے' وہ صاف شہادت دیتی ہیں کہ وہ بھی کچھ مذہب رکھتی تھیں۔ جن وحشی قوموں کو ہم نے پایا ہے اور جو اب بھی امریکہ کے جنگلوں اور افریقہ کے کناروں اور اوشینیا کے جزائر میں پائی جاتی ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ مذہب رکھتی ہیں جس کو انہوں نے اپنے باپ دادا سے پایا ہے۔ جو قومیں قدیم زمانے میں شائستہ تھیں اور جن کے حالات کتبوں اور سکوں اور تاریخ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان کے مذہب کا تو تاریخانہ ثبوت موجود ہے۔ پس ان تمام دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام انسان کچھ نہ کچھ مذہب رکھتے ہیں۔

(تہذیب الاخلاق 1296ھ م 1879ء)

حضرت ابراھیم علیہ السلام اور ان کا مذہبِ حنیف

توریتِ مقدس سے یا اور کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے تاکہ حضرت ابراہیمؑ نے کسی وقت اور کسی زمانہ میں بت پرستی کی ہو' بلکہ برخلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کبھی بت پرستی' یعنی شرک نہیں کیا۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی نسبت متعدد جگہ آیا ہے کہ وما کان من المشرکین یعنی ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا اور خود حضرت ابراہیمؑ کا قول قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: "ما انا من المشرکین" ' یعنی میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ پس بلا سند اور بلا دلیل یہ کہنا کہ حضرت ابراہیمؑ پچھتر برس کی عمر تک بت پرستی کرتے تھے' محض بے اصل اور صرف اتہام ہے۔ پچھتر برس کی عمر ہم نے توریت کے حساب سے لکھی ہے' مگر جو عمریں توریت میں لکھی ہوئی ہیں' ان کی صحت نہایت مشتبہ اور بحث طلب ہے۔

تمام انبیاء اُسی قوم میں سے پیدا ہوتے ہیں اور اُسی قوم میں پلتے اور بڑھتے ہیں' جس کی بری باتوں کی اصلاح کے لیے وہ مبعوث ہوتے ہیں' لیکن ان کا یہ امر طبعی ہوتا ہے کہ جن بری باتوں کی اصلاح وہ اپنے زمانۂ رُشد میں کرتے ہیں' ابتداء ہی سے ان کو ان سے نفرت ہوتی ہے اور اس لئے کبھی وہ ان امور میں ملوث نہیں ہوتے۔ اگر وہ ان میں ملوث ہوں تو زمانۂ رشد میں ان امور کی اصلاح ان سے ہونی نہایت مشکل ہے' کیونکہ جو مقتضائے طبیعت ہوتا ہے وہی زمانہ رشد میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس گو حضرت ابراہیمؑ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے' جو بت پرستی میں ملوث تھا' مگر صرف ایسے خاندان میں پیدا ہونے سے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے بھی بت پرستی کی ہو' اس لئے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت بت پرستی کا خیال سراسر غلط اور محض بیہودہ ہے...

جہاں قرآن مجید میں مذہب حنیف کا ذکر آیا ہے' اسی کے ساتھ اس مذہب کے شرک سے بری ہونے کا بھی ذکر آیا ہے' جس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ حنیف سے وہ مذہب مراد نہیں ہے جس میں شرک اور بت پرستی داخل ہو گئی تھی اور جس کو مُشرکانِ زمانۂ جاہلیت' مذہبِ حنیف

کہتے تھے، بلکہ خاص مذہب توحید ذات باری جو حضرت ابراھیم علیہ السلام کا مذہب تھا، لفظ حنیف سے وہی مذہب مراد ہے نہ وہ مذہب جس کو مشرکین عرب مذہبِ حنیف کہتے تھے۔

سورۃ بقرہ میں خدا نے فرمایا ہے: "وقالوا کونوا ھودا او نصاریٰ تھتدوا۔ قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین۔" (آیت 129) یعنی کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہود اور نصاریٰ تو راہ پر آؤ گے۔ اے پیغمبر کہدے کہ نہیں، ہم نے ابراہیم کا مذہب اختیار کیا ہے جو ایک خدا کا ہو رہا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

پس بت پرستی کے مذہب کو مذہب حنیف قرار دینا نہایت بڑی غلطی ہے۔

(آخری مضامین سرسید)

راہِ سنت و رَدِ بدعت

رسم پرستی

یہ اقتباس سرسید احمد خاں کے مشہور رسالہ (کتابچہ) راہ سنت و ردِ بدعت سے لیا گیا ہے۔ یہ رسالہ 1850ء میں لکھا گیا اس وقت سرسید کے اپنے الفاظ میں "وہابیت کا نہایت زور و شور سے دل پر اثر چھایا ہوا تھا۔" یہ الفاظ سرسید نے 1883ء میں اس رسالہ کو دوبارہ شائع کرتے ہوئے لکھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید آم کھانے کو بھی خلاف سنت سمجھتے تھے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے آم کبھی نہیں کھایا تھا۔

اس انتہا پسندی کے باوجود سرسید کے بیشتر نکات آج بھی اہمیت رکھتے ہیں اور ہمیں رسم پرستی کی زنجیروں کو توڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ رسوم کو مذہبی عقائد و شعار میں آج بھی شامل کیا جاتا ہے اور اس سے ہمارے دین کا چہرہ مسخ ہوا جاتا ہے۔ مرتب

جو مباح امر یعنی ایسی بات کہ جس کے کرنے سے شرع میں کچھ مضائقہ نہیں اس طرح رواج پا جائے کہ اگر کوئی اس کو نہ کرے تو اس پر طعنے تشنے ہونے لگیں اور دھتکار پھٹکار پڑنے لگے اور اس کا رواج ثواب ملنے یا عذاب سے بچنے کو نہ ہو' بلکہ اپنے باپ دادا کی رسم ٹھہر گئی ہو اور ایک دوسرے کی ریس پر کرتا ہو اس کو رسم کہتے ہیں۔ پس جتنی رسمیں شادی' غمی مرنے' جینے میں مروج ہو رہی ہیں سب کی سب بدعت ہی میں داخل ہیں' کیوں کہ ان رسموں کے بجا لانے پر وہ لوگ اس طرح پر سعی کرتے ہیں جیسے اسلام کی نشانیوں پر سعی کرنی چاہی تھی' مثلاً" اشرافوں میں یہ بلا پڑی ہے کہ دولہا کو تو ٹکے کا بھی مقدور نہیں' مگر مہر لاکھوں اور ہزاروں ہی کا باندھتے ہیں' یہاں تک کہ اسی پر قصّہ ہوتا ہے اور براتیں اٹھ جاتی ہیں اور شادیاں موقوف ہو

جاتی ہیں۔ اگرچہ مہر کا زیادہ باندھنا شرعاً" ممنوع نہیں، مگر جب اس پر اتنا اہتمام ہوتا ہے جیسے کہ ضروریات دین پر چاہیے تھا۔ تو یہ بھی گویا بدعت ہی میں داخل ہے یا یہ کہ مثلاً" بڑے خاندانی اشراف تو ہیں، مگر اس اشرافت میں یہ خاک ڈالتے ہیں کہ باوجودیکہ فاقے پر فاقہ ہونے اور نیت ڈاواں ڈول ہونے کے محنت مزدوری پیشہ حرفہ نہیں کرتے، اور پھر اس کو بڑی خوبی اور نہایت وضع داری سمجھتے ہیں۔ یا ضرورت تو درپیش ہے اور سودا لانے کی حاجت، مگر مشیخت کے مارے اور نواب زادہ پن نہ جاتے رہنے کے واسطے یا مولوی زادہ پن اور پیر زادہ پن میں بٹانہ لگنے کے لیے سودا خریدنے نہیں جاتے۔ اور اگر جبراً" قہراً" گئے بھی تو سودے والے کی دکان پر سودا لیے بیٹھے ہیں کہ کوئی ہمارے دادا جان کی رعیت ہی میں سے آجاوے یا طالب علم ہمارا شاگرد ہی مل جاوے یا کوئی مُرید نظر پڑ جاوے تو اس سے اٹھوا کر لے جاویں۔ اس قسم کی سب باتیں بدعت ہی میں داخل ہیں، کیونکہ شریعت محمدیہ میں ایسی باتوں کے پیچھے پڑنا اور ان کا اہتمام کرنا مقصود نہیں ہے۔

اسی طرح بعضی رسمیں شگون اور بدشگونی کی کفار مشرکین میں جاری ہیں کہ وہ لوگ ان کے ہونے کو شگون اور نہ ہونے کو بدشگونی سمجھتے ہیں۔ جیسے بعضے ہندوؤں میں بیاہ کے وقت مسی لگانی اور جمیع اقوام ہندوؤں میں نتھ پہنانی اور چوڑیاں ہاتھوں میں پہننی، بلکہ بعضے وقتوں میں خاص ہری ہی چوڑیاں پہننی مروج ہیں اور وہ لوگ ان رسموں کے ہونے کو شگون اور نہ ہونے کو بدشگونی سمجھتے ہیں۔ ان رسموں کو مسلمانوں نے بھی اپنے ہاں اسی طرح ہو بہو رواج دیا ہے اور اسی طرح اس کے بجالانے پر اہتمام کیا جاتا ہے جس طرح کہ ہندوؤں میں ہوتا ہے مثلاً" کنواری بیٹی کو کبھی مسی نہیں لگوانے کے، بغیر نتھ کے کبھی بیاہ نہیں کرنے کے، یہاں تک کہ اگر میسر نہ ہو گی تو مانگ کر لاویں گے۔ کنواری بیٹی چنی ڈال کر کبھی دو موتیوں کی نتھ نہیں پہنے گی اور رانڈ عورت کبھی نتھ ناک میں نہیں ڈالنے کی، چوڑیوں کا جوا سہاگن ہی پہنے گی، رانڈ نہیں پہننے کی۔

کلمتہ الحق

جو ذرا بھی شریعت کی راہ سے بھٹکا وہی راہ بھولا۔ اگر کوئی آسمان پر اڑے اور زمین میں گھسے اور ایک بال بھر شریعت سے پھرا ہو وہ گمراہ ہے۔ ولی و ابدال' غوث اور قطب ہونا کچھ کرشمہ اور کرامات نہیں ہے' بھوت اور پلیت' دیو' جن' نٹ اور بھان متی بھی بہت سے شعبدے اور تماشے دکھاتے ہیں۔ ولی و ابدال' غوث و قطب وہی ہے جو پورا پورا شریعت پر چلے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ یعنی "اللہ صاحب نے سورہ آل عمران میں فرمایا کہ اے نبی تو کہہ دے کہ اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری رہ چلو کہ اللہ تم کو چاہے۔

اس آیت سے علوم ہوا کہ آدمی کیسی ہی عبادت اور بندگی کرے' مگر اللہ اس کو جب ہی دوست رکھتا ہے جب شریعت محمدیہ علی صاحبہ الصلواۃ والسلام کا تابع ہو جاوے۔ دیکھو جوگی' بیراگی' اتیت اور فقیر کیسی کیسی محنتیں کرتے ہیں اور مصیبتیں بھگتتے ہیں اور جوگ اٹھاتے ہیں مگر جب شریعت کے برخلاف ہیں تو سب اکارت ہے اور شریعت کی تابعداری یہی ہے کہ جو اللہ اور اللہ کے رسول نے کہا اس کو کیا اور جس سے منع کیا اس کو نہ کیا۔ قال اللہ تعالیٰ "وما اتکم الرسول فخذوہ' وما نھکم عنہ' فانتھوا" یعنی اللہ صاحب نے سورہ حشر میں فرمایا' اور جو دے تم کو رسول وہ لے لو اور جس سے منع کر دے وہ مت کرو (ف)۔ یعنی رسول نے جو حکم تم کو پہنچائے ہیں ان کو قبول کرو اور جن کاموں سے منع کر دیا ہے ان کو مت کرو کہ یہی شریعت کی تابعداری ہے۔ بڑا تابعدار شرع کا وہی ہے کہ ہر بات میں جو اس کے سامنے آوے غور کرے کہ اس میں اللہ اور اللہ کے رسول کا کیا حکم ہے۔ جو حکم ہو وہی کرے اور پھر جی میں ملال نہ لاوے۔ قال اللہ تعالیٰ "فلا و ربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما" یعنی اللہ صاحب نے سورہ نساء میں اپنے رسول کو فرمایا کہ تیرے پروردگار کی قسم ان کو ایمان نہ ہو گا جب تک کہ آپس کے جھگڑے میں تجھی کو حاکم نہ بدیں پھر نہ پاویں اپنے دل میں تیرے انصاف سے کچھ بھی ملال اور اس کو مان لیں ٹھیک جان کر۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ پورا ایمان جب ہی ہوتا جب سب کام شریعت کے سپرد کر دے اور جو اس میں حکم نکلے خندہ پیشانی سے قبول کرے اور یوں جانے کہ یہی حق ہے اور یونہی ٹھیک ہے

رسالتہ کلمتہ الحق

1266ھ مطابق 1849ء

عبادت

بخاری و مسلم نے حضرت انسؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ عرب کی تین قوموں کے کچھ لوگ پیغمبر خدا ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے پاس آں حضرت ﷺ کی عبادت کا حال دریافت کرنے کو آئے۔ جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے اس کو بہت کم سمجھا اور آپس میں کہنے لگے کہ کجا ہم اور کجا پیغمبر صاحب۔ ان کو تو بہت سی عبادت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے اگلے پچھلے گناہوں سے پاک کر دیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم تو ہمیشہ تمام رات نماز پڑھا کریں گے اور دوسروں نے کہا کہ ہم ہمیشہ دن کو روزہ رکھا کریں گے اور کبھی روزہ نہ چھوڑیں گے۔ اوروں نے کہا کہ ہم عورتوں کے پاس نہ جاویں گے اور کبھی جورو نہ کریں گے۔ اتنے میں جناب پیغمبر خدا ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا کہ تم نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں۔ جانو خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ اس کے حضور میں پاک رہنا چاہتا ہوں' لیکن میں تو روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور نماز بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی رہتا ہوں۔ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پھر جو کوئی میرے طریقہ کو پسند نہ کرے وہ میرے ساتھیوں میں سے نہیں۔

یہ حدیث ہم مسلمانوں کے لئے بہت بڑی سند اس بات کی ہے کہ اصلی اور سچی عبادت وہی ہے جو قانون قدرت کے اصول کے مطابق ہے۔ تمام قویٰ جو خدا تعالیٰ نے انسان میں پیدا کئے ہیں' وہ اس لئے پیدا نہیں کئے کہ وہ بیکار کر دیئے جاویں' بلکہ اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ سب کام میں لائے جائیں۔ شریعتِ حقۂ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام نے کوئی نئی بات نہیں پیدا کی' بلکہ صرف ان قویٰ کے کام میں لانے کے طریقہ کو بتایا ہے جس سے جملہ قویٰ اعتدال پر اور شگفتہ و شاداب رہیں اور ایک کے غلبہ سے دوسرا بیکار اور پژمردہ نہ ہو جاوے' مگر بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس نکتہ کو سمجھتے ہیں' بلکہ اس طریقہ کو جس کو ہمارے پیغمبر خدا ﷺ نے رہبانیت قرار دیا ہے اور جس کو ہندی زبان میں جوگی یا جوگ کہتے ہیں کمال عبادت اور منتہائے زہد و تقویٰ قرار دیتے ہیں۔

فرائض جو مذاہب اسلام میں ہیں ان کا ادا کرنا بلاشبہ باعثِ نجاتِ ابدی ہے

عبادت - تہذیب الاخلاق

15 محرم' 1288ھ

(م 6 اپریل 1871ء)

علوم، معرفتِ الٰہی کا وسیلہ ہیں

وہ علوم بھی جن کو ہم علوم دنیوی کہتے ہیں، اگر ان کی تعلیم نیک طرح پر ہو تو باعثِ ترقیٔ ایمان اور سببِ محبت اور ترقیِ معرفتِ ذاتِ باری تعالیٰ جل شانہ کے ہوتے ہیں۔ امام غزالی صاحب احیاء العلوم میں جہاں خدا تعالیٰ کی محبت کے اسباب کو بیان فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ قوتِ معرفت سببِ قوتِ محبت ہے اور یہ بات خدا تعالیٰ کی صفات اور ملکوت سموات و ارض پر دھیان لگانے سے ہوتی ہے، اس لئے کہ کوئی ذرہ آسمان و زمین سے ایسا نہیں ہے جو اس کی حکمتوں اور عجیب نشانیوں سے خالی ہو۔ جس ذرہ پر نظر کی جاوے وہ اس کی قدرتِ کاملہ پر شہادت دیتا ہے، اور جس برگِ درخت پر نظر کی جاوے، اس کی حکمتِ بالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ کوئی دانہ زمین سے نہیں اگتا کہ اپنے اگانے والے کی توحید پر ہزار زبان سے اقرار نہ کرتا ہو اور اس کی قدرت کاملہ پر ہزار طرح سے شہادت نہ دیتا ہو۔ جس درخت پر نظر کی جاوے ہر ورق اس کا اللہ جل شانہ کی وحدانیت کا مُقِر ہے اور جس ورق پر غور سے خیال کیا جاوے اس کی معرفت کا دفتر ہے اور ان سب باتوں کا علم باعثِ ایمانِ کامل اس اس قادر مطلق پر ہے جس کی عبادت کرنا عین مسلمانوں کا ایمان ہے۔ پس تمام علوم دنیوی اس اعتبار سے علوم دینیہ سے کم نہیں ہیں۔

جس وقت کہ ہم علم ریاضی پڑھ کر خدا تعالیٰ کی اس قدرت کاملہ سے واقف ہوتے ہیں جو خلق آسمان و زمین و کواکب سیارہ و ثوابت میں کام آئی ہے، اور کتنے بڑے بڑے کُرات کو کیسی سریع حرکت سے معلق پھرتے دیکھتے ہیں، اور اس کی عجائب حکمت کو دریافت کرتے ہیں تو کس طرح ہم کو وجود صانع اور اس کی قدرت کاملہ پر یقین ہوتا ہے۔

جس وقت کہ ہم علم ارض، یعنی جیالوجی پڑھتے ہیں اور ان عجائبات سے واقف ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے صرف اس کرہ خاک میں بنائے ہیں جو دن رات ہمارے پاؤں کے تلے روندا جاتا ہے تو ہم کو کیسا مستحکم اس خدا کی خدائی پر یقین ہوتا ہے۔

علم نباتات اور علم حیوانات سے جب ہم کو واقفیت ہوتی ہے تو پھولوں کی پنکھڑیوں کی رنگ آمیزی اور مکھی کی آنکھ کی پچکاری ہی ہم کو اس حکیم مطلق کی حکمت کاملہ پر یقین کامل دلاتی ہے۔

اسی طرح تمام علوم، کیا علم آب اور کیا علم ہوا اور کیا علم جر ثقیل اور کیا علم برق و مقناطیس سب کے سب ہماری معرفت کو قوت اور ہمارے ایمان کو خدائے واحد پر پختہ اور مستحکم کرتے ہیں اور حق الیقین، بلکہ عین الیقین کے مرتبہ تک پہنچاتے ہیں۔ پس اگر اس اعتبار سے ہم ان علوم کو بھی علوم د-نیہ کے شامل سمجھیں تو کچھ بعید نہیں۔

(عبادت)

16 اپریل 1871ء

اسلام اور علومِ دینی و دنیوی

خدا تعالیٰ نے ہم کو ہمارا مذہب ایسا عمدہ دیا ہے جو ہماری معاد اور معاش دونوں کو قانون قدرت کے مطابق اصلاح کرنے والا اور ترقی دینے والا ہے۔ جس طرح کہ ہم اس بات کو خیال کر سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دنیوی کی تحصیل کیا کریں تو دین کا کیا حال ہو گا؟ اسی طرح اگر تمام لوگ صرف علوم دینی ہی پڑھا کریں تو ہماری دنیا کا جس کی اصلاح شریعت سے خارج نہیں ہے' کیا حال ہو گا؟ .... پس ہمارا فرض ہے کہ ہم دونوں قسم کے علوم کی ترویج پر سعی و کوشش کریں اور ایک کو دوسرے کا آلہ سمجھ کر دونوں کو پڑھنا اور پڑھانا داخل عبادت جانیں۔

عبادت - تہذیب الاخلاق

6 اپریل 1871ء

یورپ پر اسلام کے احسانات

یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ تمام علوم طبیعات، ہیئت، فلسفہ، ریاضی، جو دوسری صدی میں یورپ میں جاری تھے ابتدا" عرب کے علماء سے حاصل ہوئے تھے اور خصوصا" اندلس کے مسلمان یورپ کے فلسفہ کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔

جان ڈیون پورٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"یورپ مذہب اسلام کا اور بھی زیادہ ممنون ہے، کیونکہ اگر ان جھگڑوں سے جو سلطان صلاح الدین کے وقت میں بیت المقدس کی لڑائیوں میں ہوئے جس کو فریقین جہاد کہتے تھے، قطع نظر کی جاوے تو بالتخصیص مسلمانوں کے سبب سے فیوڈل انتظام کی سختیاں اور اسیروں کی خود مختاری یورپ سے موقوف ہو گئی۔ جس کے باقی ماندہ اثروں پر ہمارے ملک یورپ کی آزادیوں کی نہایت بڑی عالی شان عمارت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اہل یورپ کو یہ بات بھی یاد دلانی چاہیے کہ حضرت محمدؐ کے پیروؤں کے (جو قدیم اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان میں بطور سلسلہ کے ذریعہ ہیں) وہ اس لحاظ سے بھی ممنون ہیں کہ مغربی تاریکی کی مدت دراز میں یونانی حکما کی بہت سی کتابیں انہی کی کوششوں سے فنون اور علم ریاضی، طب وغیرہ کے بعض نہایت بڑے بڑے شعبوں کی اشاعت ہوئیں۔"

اسلام اور خاتمۂ غلامی کی تدبیریں

اس میں کچھ شک نہیں کہ قبلِ نزولِ آیتِ حریت جو غلام موجود تھے ان کو اسلام نے دفعتہً آزاد نہیں کیا اور نہ ان کے ان تعلقات کو توڑا جو بموجب رسم زمانہ جاہلیت ان میں تھے' بلکہ آئندہ کی غلامی کو معدوم کیا اور موجودہ غلاموں کے لیے بہت سی تدبیریں ان کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جانے کی کیں۔ جو لوگ اصولِ انتظامِ مدن سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی ملک کے اور خصوصاً" عرب کے سے ملک کے جس میں لونڈیوں و غلاموں کے تعلقات ان کے آقاؤں سے ایک عجیب سی قسم کے اور نہایت پیچ در پیچ تھے تمام لونڈیوں اور غلاموں کا دفعتہً آزاد کر دینا کیسا مشکل اور کس قدر مختلف قسم کی خرابیوں اور دقتوں' بلکہ انواع اقسام کے گناہوں کا مورث ہوتا' اس لیے دفعتہً ان کا آزاد کرنا غیر ممکن عادی تھا۔ پس اسلام نے عین رحمت اور حکمت کی جو ان کو دفعتہً آزاد نہیں کیا' بلکہ ان کے رفتہ رفتہ آزاد ہونے کی اور آئندہ کی مسدودی کی تدبیر کی۔

بارہ سو برس بعد اس واقعے بڑے بڑے مدبروں نے جو غلامی کے معدوم ہونے میں کوششیں کیں وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے کہ آئندہ کی غلامی کو بند کیا اور موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہونے کی تدبیر کی۔ البتہ ان کی تدبیروں میں اور بانی اسلام کی تدبیروں میں اتنا فرق تھا کہ ان کی تدبیریں زیادہ تر مادی چیزوں سے علاقہ رکھتی تھیں اور بانیٔ اسلام کی تدبیریں زیادہ تر روحانی چیزوں سے متعلق تھیں۔

اس نے غلاموں کے مالکوں کو وحی کی رو سے سمجھایا کہ "غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ کوئی پیاری چیز اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔"

اس نے بعض گناہوں کے کفارے میں بردہ آزاد کرنے کا حکم دیا۔

صاف یہ حکم دیا کہ اگر غلام کما کر اپنی قیمت ادا کرنی چاہیں تو اقرار نامہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔

ایسے غلاموں کو جن کے مالکوں نے قیمت لے کر آزاد کرنے کا وعدہ کیا ہے خیرات دینے اور

چندہ دینے پر رغبت دلائی۔

بیت المال میں سے مکاتب غلاموں کی آزادی کے لیے روپیہ دینا تجویز کیا۔

بعض حالتیں ایسی مقرر کیں کہ ان میں لونڈیاں از خود بلا آزاد کیے آزاد ہو جائیں۔

ایسے معاہدے یا اقرار کو جس میں ذرا سا بھی اشتباہ معاہدے یا اقرار آزادی کا ہو بمنزلہ معاہدہ و اقرار کامل آزادی کے اقرار دیا۔

(تہذیب الاخلاق 1871ء)

غلامی کی لغت سے اسلام کی بریت

آزادی جو ہر انسان کا قدرتی حق ہے' غلامی ٹھیک ٹھیک اس کو برباد کرنے والی ہے۔ قدرتی حقوق کو برباد کرنا اصلی ظلم اور ٹھیٹ ناانصافی ہے۔ پس انسان ایسی خطاؤں کا خطاوار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ناقابل سہو و خطا نہیں ہے۔ مگر خدا ایسے قصور کا تقصیروار نہیں ہو سکتا' وہ تمام خطاؤں سے پاک اور تمام تقصیروں سے مبرا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اگر غلام آرام و آسائش سے رکھے جاویں اور رحم و محبت سے پرورش کئے جائیں گے تو کوئی برائی نہیں ہے' محض غلطی اور سر تا سر دھوکا ہے۔ غلامی فی نفسہٖ ایک قدرتی گناہ ہے اور ان کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہے۔ پس کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔

غلامی تمام اخلاق انسانی کو خراب کرنے والی ہے۔ غلاموں کے حالات اور ان کی عقل اور عادات انسانی حالت سے تنزل کر کے حیوانی حالت میں آجاتے ہیں' اور جو لوگ غلام بناتے ہیں وہ جبراً" اور ناانصافی سے انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے تنزل کی حالت میں ڈالتے ہیں۔ غلامی کی حالت میں انسان کے تمام قدرتی قویٰ جن کو خدا نے وسیلۂ ترقی بنایا ہے معطل و بے کار ہو جاتے ہیں' اور ان کی حالت ہر طرح پر ان کی ترقی کی جن کی ترقی کرنا قدرت کے قانون بنانے والے قادر مطلق کی مرضی ہے مانع ہوتی ہے۔

محنت و مشقت اٹھانے کی قوت جو خدا نے انسان میں اس مراد سے پیدا کی ہے کہ انسان اپنی ترقی اور بھلائی کے لیے صرف کرے' غلاموں میں بالکل معدوم ہوتی ہے' کیونکہ ان کی کوئی محنت ان کے لیے نہیں ہے۔

محبت و الفت جو انسان کی زندگی کی جان ہے اور جس پر دین و دنیا دونوں کی بھلائی منحصر ہے غلامی کی حالت میں بالکل مردہ ہو جاتی ہے۔ جو لطف اور انس و محبت ازدواج سے پیدا ہوتا ہے وہ غلاموں کو حاصل نہیں ہوتا۔ ان کا ازدواج وحشی جانوروں کے ازدواج سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ اولاد کی محبت اور ان کی پرورش کا جوش جتنا کہ جانوروں میں ہے غلاموں میں اتنا بھی نہیں

ہوتا۔ غلاموں میں ولولہ ہمدردی کا کسی سے' یہاں تک کہ اپنی اولاد سے بھی مطلق نہیں ہوتا۔ بے وفا ہونا اس کی ایک مشہور صفت ہو جاتی ہے۔

مالکیت کی جو ایک قدرتی خوشی ہے وہ غلاموں میں بالکل معدوم ہوتی ہے' کیونکہ وہ کسی چیز کے' یہاں تک کہ خود اپنے آپ کے بھی مالک نہیں ہوتے اور یہ حالت ادنیٰ سے ادنیٰ جاندار سے بھی جس کو خدا نے پیدا کیا ہے' نہایت کمینہ اور بدتر حالت ہے

تہذیب الاخلاق 1288ھ م 1871ء

مسمریزم وھو علم السیمیا

کہا جاتا ہے کہ اس علم یا فن کو مسی مسمیر ایک شخص نے جو فرانس کا رہنے والا تھا' 1776ء میں دریافت کیا تھا' مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا میں بہت پہلے یہ فن دریافت ہو چکا تھا۔

مسمریزم جس کا نام اب "انیمل میگنی ٹزم" قرار دیا گیا ہے وہی ہے جس کو ایشیا کے حکماء علم سیمیا کہتے تھے۔ دونوں کے متحد واقعات اور ایک سے حالات ہیں۔

ڈکشنری آف یونیورسل انفاریشن میں مسمریزم کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک اثر ہے جو شخص عامل سے نکلتا ہے اور شخص معمول پر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے عجیب نتیجے اس شخص معمول کے جسم پر اور خیالات پر پیدا ہوتے ہیں اور عامل کو معمول کے جسم اور خیالات پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ مسمریزم ایک فن ہے جس کے ذریعے سے کسی آدمی کے دماغ اور رگوں پر ایسی عجیب اور خلاف معمول حالت طاری کر دی جاتی ہے کہ عامل کو معمول شخص کی حرکات پر پوری قدرت حال ہوتی ہے اور اس کی روح سے براہ راست گفتگو وغیرہ کر سکتا ہے۔

اخوان الصفا کے لکھنے والے تو جادو' طلسمات' گنڈے تعویذ' جھاڑ پھونک سب کے قائل ہیں .... وہ اس اثر کے بھی قائل تھے جو سیمیا یا مسمریزم یا انیمل میگنی ٹزم کہا جاتا ہے

وہ لکھتے ہیں کہ :

(ترجمہ) تعویذ' جھاڑا پھونکی اور اس کی مانند جو کچھ ہے یہ نہایت لطیف روحانی اثر نفسِ ناطقہ کے ہیں جو دوسرے کے نفس بہیمہ اور حیوان میں اثر کرتے ہیں اور ان میں تاثیرِ قوی اور مختلف اعمال پیدا کرتے ہیں اور ہم نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ اگر انسان ان کے سامنے بیٹھے تو ایک ساعت میں اس کو بے ہوش کر کے گرا دیتے ہیں اور اس کا سبب ایک اثر لطیف نفس کا ہے جو دوسرے نفس میں اثر کرتا ہے جیسے آگ کا شعلہ دوسری چیز میں پہنچ کر اس کو جلا دیتا ہے (انتہی ملخصاو مقصرا") از اخوان الصفا جلد چہارم صفحہ 307

یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کہ یہ فن 1776ء میں مسمیر نے دریافت کیا تھا' بلکہ اس سے بہت پہلے ابن سینا اور شہاب الدین سہروردی مقتول کو بھی معلوم تھا جس کو سلطان صلاح الدین نے 586ھ میں قتل کیا' بلکہ اگر ہم اس سے بھی اوپر خیال کریں تو یقین کر سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے وقت میں کہنہ فرعون کو بھی معلوم تھا۔

اس بات میں کہ اس کے آثار کیونکر ظاہر ہوتے ہیں اختلاف ہے' بعض کا یہ یقین ہے کہ انسان میں مثل مقناطیس کے ایک قوت ہے اور وہ معمول کے نروس سسٹم پر' یعنی اعصاب دماغی و بدنی پر اثر کرتی ہے اور معمول کے خیال اور بدن میں افعال عجیبہ جس طرح کے کہ عامل چاہتا ہے پیدا کرتی ہے۔

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ عامل میں سے کوئی قوت خارج نہیں ہوتی' بلکہ خود معمول ہی کی قوت متخیلہ سے وہ آثار و افعال اس میں پیدا ہو جاتے ہیں' مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ پہلی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے اور تمام مشاہدات سے جو اس فن کے عاملوں سے مشاہدہ ہوئے ہیں اس کی صحت پائی جاتی ہے۔

بہت لوگ ہیں جو اس فن کو لغو و مہمل سمجھتے ہیں اور اس کے قائل نہیں ہیں اور بہت ایسے ہیں جو اس پر نہایت یقین رکھتے ہیں اور جو کچھ عجائبات اس کی نسبت کہی جاویں سب کو سچ سمجھتے ہیں' مگر اس پر بہت لوگوں کو اتفاق ہو جاتا ہے کہ اس عمل کا اثر انسان کے نروس سسٹم پر ضرور ہوتا ہے اور جو افعال نروس سسٹم کے موثر ہونے سے ظاہر ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ قوت مقناطیسی ہر ایک انسان' بلکہ حیوان میں بھی پائی جاتی ہے۔ بعض انسانوں میں یہ قوت قدرتی بہت ہی قوی ہوتی ہے اور بعضوں میں اس سے کم اور بعضوں میں اور کم اور بعضوں میں نہایت کم۔ وہ تفاوت انسانوں میں ایسا ہی ہے جیسے کہ اور قویٰ میں ہے۔

خاص اس قوت مقناطیسی کے قوی کرنے کی اور اس کے عمل میں لانے کی مشق بڑھانے کے لیے خاص خاص طریقے ایجاد ہوئے ہیں اور ہر ایک انسان جس میں یہ قوت معتدبہ ہو اس کو قوی کر سکتا ہے' مگر زہد و تقویٰ و مجاہدہ اور ریاضت جو خالصاً للہ اور بلا خیال کسی امر کے اختیار کیا جاتا ہے اس کا لازمہ اس قوت کے قوی ہو جانے کا بھی ہوتا ہے' گو کہ اس کو اس قوت کے قوی وہ جانے کا خیال بھی نہ ہو۔ درویشوں کے نفوس زاکیہ جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے ہیں وہ اسی قوت کے قوی ہو جانے سے موثر ہوتے ہیں۔

جبکہ یہ قوت بہت قوی ہو جاتی ہے تو خود اپنے آپ پر اس کا اثر ہوتا ہے اور جو خیال اس

کے دل میں آتا ہے اس کو وہ خود مشاہدہ کرتا ہے اور جس میں قدرتی یہ قوت قوی ہوتی ہے اس کا اثر خود اس پر بہت قوی ہوتا ہے۔

تہذیب الاخلاق
یکم صفر 1312ھ
4 اگست 1894ء

ایک تدبیر
یتیم اور لاوارث بچوں کے پرورش کی

ہندوستان میں قحط کی بلا اکثر آتی ہے اور خصوصاً اس بلا میں اور نیز دیگر واقعات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے صغیر السن بچے یتیم اور لاوارث رہ جاتے ہیں جن کی پرورش کا کچھ ٹھکانا نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ کوئی ایسی تدبیر نہیں کر سکتی نہ ایسا خرچ اختیار کر سکتی ہے جس کے ذریعے سے ان کی تعلیم ہو، اور اس لیے گورنمنٹ ایسے یتیم اور لاوارث بچوں کو ان لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جو ان دونوں باتوں، یعنی ان کی پرورش اور ان کی تعلیمِ ضروری کے ذمہ دار ہوں۔

پادری صاحبان جو ہمارے ملک میں ہر جگہ موجود ہیں اور عیسائی قومیں اپنے مذہب کی ترقی کے لیے لاکھا روپیہ چندہ کر کے ان کو دیتی ہیں۔ ان کو ایسے یتیم و لاوارث بچوں کے عیسائی بنا لینے کا خوب موقع ملتا ہے اور وہ ان کی پرورش اور تعلیم کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور لے جاتے ہیں اور فی الفور اس معصوم بچے کو اصطباغ دے کر عیسائی بنا لیتے ہیں۔ اور اب بسبب حادثات پے در پے کے اس امر ناواجب اور نامناسب کی ایسی کثرت ہو گئی ہے کہ قحط کے یتیم اور لاوارث عیسائی کیے ہوئے بچوں سے گاؤں کے گاؤں آباد ہو گئے ہیں۔

اگر جوان عاقل و بالغ آدمی کسی مذہب کا عیسائی ہو جاوے یا مسلمان ہو جاوے تو کوئی الزام یا افسوس کی بات نہیں ہے، مگر صغیر السن یتیم لاوارث بچوں کو ایسی مصیبت و رحم کی حالت میں عیسائی کر لینا جس کے سبب سے وہ اپنی تمام قوم و برادری اور رشتہ مندوں سے مثل مُردے کے منقطع ہو جاتے ہیں اور تمام عمر کے لیے اس خوشی سے جو اپنی قوم میں شامل رہنے سے ہوتی ہے، مجبوراً بلا اپنی مرضی کے محروم ہو جاتے ہیں، نہایت افسوس اور نہایت نفرت کے لائق بات ہے، اور رحم اور انسانیت اور نیکی اور نیک دلی سے نہایت بعید ہے۔ اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ ہرگز یتیم بچوں پر رحم نہیں کرتے، بلکہ خود غرض متصور ہوتے ہیں اور درحقیقت ان یتیم بچوں پر ان کی بے کسی کی حالت میں ظلم کرتے ہیں جو بغیر ان کی مرضی جائز کے ان کو ہمیشہ کے

لیے ان کی قوم سے منقطع کر دیتا ہے۔

جو شخص رحم دل ہو گا اور یتیم بچوں پر بغیر کسی نفسانی خواہش کے صرف اس وجہ سے رحم کرتا ہو گا کہ مقتضائے انسانیت ان پر رحم واجب ہے' وہ ایسے فعل کو جیسا کہ اب ہو رہا ہے اور جس پر پادری صاحبوں کا عمل در آمد ہے اور جس کا ظہور ایک نہایت سختی اور بے رحمی کے ساتھ مدراس کے قحط میں پادری صاحبوں کی جانب سے ہوا ہے جو اخباروں میں مندرج ہے' نہایت بے رحمی تصور کرتا ہو گا اور جو لوگ ہر ایک کام کو بنظر ثواب عقبیٰ کیا کرتے ہیں وہ بھی اس بات کو نہایت ناپسند کرتے ہوں گے' کیونکہ کوئی مسلمان یا ہندو اس بات سے خوش نہ ہو گا کہ یتیم لاوارث بچے ہندو یا مسلمان کے ایسی بے رحمی سے عیسائی بنائے جاویں۔ پس میں نہایت عجز و انکسار اور دلی جوش حب وطنی سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے' رام جی کے واسطے اپنی قوم کے یتیم اور لاوارث بچوں پر رحم کرو اور ان کی پرورش کے لیے ان تدبیروں میں میرے ساتھ شریک ہو جو مدت ہائے دراز سے میں نے سوچی ہیں اور جن کے پورا کرنے کی میری کمال آرزو ہے اور وہ تدبیریں حسب مندرجہ ذیل ہیں:

(1) ضلع علی گڑھ میں جس کی آب و ہوا نہایت عمدہ ہے کسی مقام پر جو شہر سے فاصلے پر ہو اور کسی قصبے یا گاؤں کے قریب ہو' زمین لی جاوے اور وہاں مکانات مناسب یتیم بچوں کے رکھنے اور پرورش پانے کے لیے بنائے جاویں۔

(2) ہندو اور مسلمان دونوں اس کام میں شریک ہوں اور ہر قوم کے یتیم و لاوارث بچوں کے پرورش پانے کے لیے وہ متصور ہو۔

(3) یتیم بچے جو اس میں پروش پاویں وہ ایسی تدبیر سے پرورش پاویں کہ کسی بچے کی ذات میں اور کسی بچے کے مذہب میں جو اس کے ماں باپ کا ہو ذرا فرق نہ آنے پاوے۔ مسلمان بچوں کی پرورش کے لیے مسلمان مرد عورتیں مقرر ہوں اور ہندو مذہب کے بچوں کی پرورش کے لیے بلحاظ ان کی ذات و مذہب کے برہمن وغیرہ مقرر ہوں۔

(4) اسی مقام پر جہاں وہ بچے پرورش پاویں ایک مکتب ہو جس میں اردو ہندی کی ضروری تعلیم لڑکوں کو دی جاوے اور اسی مقام پر کچھ کام سکھلانے کا مثل دری بافی' قالین بافی یا نجاری لوہاری وغیرہ پیشوں کا کارخانہ ہو اور وہ لڑکے اس کارخانے میں کوئی پیشہ سیکھ لیں اور جب وہ جوان ایک معین حد تک پہنچ جاویں اور خود اپنے لیے آپ کمانے کے لائق ہو جاویں وہاں سے خارج کیے جاویں۔

(5) اسی طرح اور اسی قاعدے پر یتیم لڑکیوں کی بھی پرورش و تعلیم و تربیت' ایک جدا

مکان میں جو اسی جگہ ہو' کی جاوے۔ لڑکیاں جب جوان ہو جاویں تو وہ دفعتہً خارج نہ کر دی جاویں بلکہ ان کے نکاح' بیاہ' شادی کی کوئی تدبیر کر دی جاوے' تاکہ نیکی اور نیک نیتی سے وہ اپنی زندگی بسر کریں۔

(6) اس کام کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہو جس میں ہندو و مسلمان سب شریک ہوں اور اسی کمیٹی کے ذریعے سے ان سب چیزوں کا انتظام اور عمل در آمد کیا جاوے۔

(7) تمام لوگ ہندو و مسلمان اس کام کے لیے چندہ دیں اور جو ذی مقدور ہیں وہ کچھ مہینہ مقرر کر دیں۔ جو زمیندار و تعلقہ دار ہیں وہ غلے سے' لکڑی سے' برتنوں سے ہمیشہ اس یتیم خانے کی مدد کیا کریں اور یہ یتیم خانہ ایسا مستحکم اور مستقل ہو جاوے جس کے قیام پر بخوبی بھروسا ہو اور ہم گورنمنٹ کو بتلا سکیں اور کہہ سکیں کہ اس کے قیام کی تدبیریں ایسی مستحکم ہو گئی ہیں جن کے قائم رہنے اور بخوبی چلنے میں کچھ شبہ نہیں ہے۔

(8) اگر یہ تدبیر جیسا کہ میں نے کہا' کامل ہو جاوے تو اس وقت گورنمنٹ کے سامنے نہایت ادب اور عاجزی سے درخواست پیش کی جاوے گی کہ ہماری کمیٹی یتیم و لاوارث بچوں کی پرورش کو موافق ان کی ذات و مذہب کے موجود ہے' آئندہ سے جو یتیم و لاوارث بچے ہندو یا مسلمان کے ہوں وہ اس کمیٹی کے سپرد کیے جاویں اور پادری صاحبوں کو ان کی سپردگی' جو صرف بغرض ان کے عیسائی بنانے کے لیتے ہیں' نہ حقیقتہً یتیموں پر رحم کرنے کو بند ہو جاوے۔

(9) میں نہایت اعتماد اور نہایت بھروسے اور اپنے یقین کامل سے جو مجھ کو گورنمنٹ کے عدل و انصاف پر ہے اور اس یقین کامل سے کہ گورنمنٹ کی مرضی کسی قسم کی مداخلت مذہبی کی نہیں ہے' اور اس امر کے یقین سے کہ بمجبوری یتیم بچے پادریوں کے سپرد ہوتے ہیں گورنمنٹ کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ وہ یتیم بچے عیسائی بنائے جاویں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ فی الفور گورنمنٹ اس درخواست کو منظور کرے گی اور پادریوں کو یتیم بچوں کا سپرد ہونا قطعاً" بند کر دے گی' بشرطیکہ ہم درستی سے ان کی پرورش کا سامان مہیا کرلیں۔

(10) میں دوبارہ اپنے ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ درخواست کے منظور ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے اور یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ اس امر کی پیروی میں جہاں تک ذاتی پیروی درکار ہے میں کروں گا۔ میں یہاں تک اقرار کرتا ہوں کہ اس درخواست کو ملکہ معظمہ انگلستان و قیصر ہندوستان کے پائے تخت پر رکھنے کی ضرورت ہو تو میں خود لندن جا کر حضور ممدوح کے پائے تخت پر رکھوں گا' مگر کبھی خیال کرنا نہیں چاہیے کہ ایسی ضرورت پڑے گی۔

(11) پس میں اس کمیٹی کا قائم ہونا چاہتا ہوں اور ضلع علی گڈھ کے تمام ہندو مسلمان

رئیسوں سے درخواست کرتا ہوں کہ جو صاحب اس تجویز کو پسند کرتے ہوں وہ علی گڑھ میں بتاریخ بیسویں مئی 1877ء وقت سات بجے صبح کے سائنٹیفک سوسائٹی ہال میں تشریف لاویں اور اس تجویز کو کامل و جاری کرنے کے مقصد سے جو جو قواعد و تجویزیں اور ابتدائی تدبیریں کرنی مناسب ہوں ان کو تجویز کریں، اور کمیٹی قرار دے دیں۔ اور اس کے ممبر مقرر ہو جاویں، تاکہ آئندہ کارروائی شروع ہو اور جو صاحب شہرہائے دور دراز کے رہنے والے ہیں وہ اپنی تحریریں اس باب میں تاریخ مذکورہ سے پہلے راقم آثم پاس بھیج دیں، تاکہ وہ سب تحریریں اس مجلس میں پڑھی جاویں۔

تہذیب الاخلاق۔ یکم جمادی الاول

1294ھ

قومی اتفاق

قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنی لازم ہے۔ زمانۂ دراز سے جس کی ابتداء تاریخی زمانے سے بھی بالاتر ہے' قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ بابی انت و امی نے اس تفرقۂ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا مٹا دیا اور ایک روحانی رشتہ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے' تمام قومی رشتے' سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی' بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہو گیا۔

اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک' وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا' وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا' وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں' وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقیٰ کلمہ توحید کو مستحکم کیا وہ ایک قوم ہو گیا! بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا! کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے:

"انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم تُرحمون۔

کون شخص ہے جو دو بھائیوں کو ایک باپ کا بیٹا نہیں جانتا؟ پھر جبکہ خود خدا نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک روحانی باپ کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا؟

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں' مگر مثل برادران یوسف کے ہیں۔ آپس میں دوستی اور محبت' یک دلی اور یک جہتی بہت کم ہے۔ حسد' بغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس کی نااتفاقی ہے۔ شیطان' جس نے خدا سے وعدہ کیا کہ "لاقعدن لھم صراطک المستقیم" ایک مقدس اور بظاہر نہایت نورانی حیلے

سے آپس میں بھائیوں کے، جن کو کہ خدا نے بھائی بنایا ہے، نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جس طرح کہ ہمارے باپ حضرت آدم اس کے دھوکے کو خالص دوستی سمجھ کر دھوکے میں آگئے، اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور اس نفاق کو جو ہر حالت میں مردود ہے، ایک مقدس لباس پہناتے ہیں، یعنی "مذہبی مقدس لباس کا خلعت" اسے عنایت کرتے ہیں۔

کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا ہے کہ:

من قال لا الٰہ الا اللہ فھو مسلم۔ من استقبل قبلتنا فھو مسلم و من ھُو مُسلم فھو اَخ۔

امام اعظم کا مذہب مشہور ہے:

لا نکفر اھل القبلتہ

بایں ہمہ فروع مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کس طرح ہماری قوم نے اس حبل المتین کی بندش کو توڑا ہے اور اس رشتہ اخوت کو جسے خود خدا نے قائم کیا تھا، چھوڑا ہے۔ جس قصبے اور شہر میں جاؤ، جس مسجد اور امام باڑے میں گزرو، باہم مسلمانوں کے شیعہ و سنی، وہابی و بدعتی، لامذہب و مقلد ہونے کی بنا پر آپس میں نفاق و عداوت پاؤ گے۔

ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثر بد پہنچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے مبدل کریں۔

یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر قائم ہو جائیں، یہ امر تو قانونِ قدرت کے برخلاف ہے جو ہو نہیں سکتا۔ نہ تو پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔

اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پائے گا۔ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر سے الفاظ میں یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے، جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست نہ آشنا اور نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی

صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے، کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنی، وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب ہے یا مقلد یا نیچری یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے، جب کہ وہ خدا و خدا کے رسول کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیے، بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمے کا شریک سمجھنا، اور اس اخوت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے، قائم رکھنا چاہیے۔

مسلمانانِ یارقند

سرسید احمد خاں کو عالم اسلام سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ اپنے عہد کی اسلامی تحریکوں سے خوب واقف تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی ملکوں کے حالات سے برصغیر کے مسلمانوں کو باخبر رکھنا چاہتے تھے۔

رابرٹ شا نے 1868ء میں یارقند کے علاقہ کا سفر کیا اور 1871ء میں ان کا سفرنامہ شائع ہوا۔ سرسید نے اس کا انتخاب تہذیب الاخلاق میں شائع کیا۔ اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یارقند کے مسلمانوں کے جو حالات پیش کیے گئے ہیں وہ ایک روشن تصویر پیش کرتے ہیں۔

مرتب

انتخاب سفرنامہ رابرٹ شا صاحب

صاحب موصوف نے کانگڑہ سے اپنا سفر شروع کیا' اور جب وہ شہر لیہ میں پہنچے جو لداخ سے آگے جانب شمال میں واقع ہے تو وہاں کے لوگوں کا حال انہوں نے اس طرح پر لکھا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ جب میں لیہ میں پہنچا تو میں نے تبت کے باشندوں کے چال چلن اور رسم و رواج کو فوراً" تحقیق کرنے کا ارادہ کیا لیکن جبکہ میں پہلے پہل شہر کی سیر کو نکلا تو وہاں کے لوگوں کے حالات دریافت کرنے کا جو جوش تھا وہ سب جاتا رہا اور اس کے عوض میں ایک دوسری بات کا شوق دل میں اٹھا کیونکہ جو لوگ اس ملک میں تھے یعنی تبتی' ان سے بالکل مختلف قسم کے لوگ ترکی بازار میں چلتے پھرتے یا خاموش قطاروں میں بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے سفید عمامے تھے۔ لمبی ڈاڑھی اوپر چغہ زمین تک لمبا' سامنے سے کھلا ہوا' پہنے صدری پہنچے تھے اور پاؤں میں کالے چمڑے کے موٹے موٹے بوٹ تھے۔ ان سب باتوں سے ان کا ایک رعب داب معلوم ہوتا تھا اور ان کا برتاؤ نہایت شستہ تھا جس سے لوگوں کے دل میں ان

کا ادب پیدا ہوا۔ ان میں ہندوستانیوں کی سی خوشامد نہ تھی اور نہ تبتیوں کی سی نقالی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا بندروں کے بیچ میں آدمی ہیں۔ جب میں ان سے ملا تو ان کا مزاج بالکل خوفناک نہ پایا جیسا کہ ان کے ہم وطنوں کا سنتا تھا۔ وہ لوگ ہمارے خیمے میں آکر بیٹھتے اور بذریعۂ مترجم کے دوستانہ بات چیت کرتے تھے اور نہایت مزے سے ہماری چائے پھونک پھونک کر جرعہ جرعہ کر کر پیتے تھے' برخلاف ہمارے ہندوستان کے ڈرپوک مسلمانوں کے جو اس قدر ہندو ہو گئے ہیں کہ ایسا کرنے سے ان کی ذات جاتی رہتی ہے۔ ہمارے مہمان دراصل بہت اچھے لوگ تھے۔ آزادی کے ساتھ گفتگو کرتے مگر کبھی حد مناسب سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بھی عزت کرتے ہیں اور جس سے گفتگو کرتے ہیں اس کی بھی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ جب رخصت ہوتے تو مودب طور پر سلام کر کے رخصت ہوتے۔ رنگ میں اہل یورپ سے، کچھ کم نہیں ہیں۔ لال ہونٹ اور گلاب کے رنگ کا سا چہرہ ہوتا ہے۔ جب ہم پہلے پہل وہاں پہنچے تھے تو ایک شخص عمدہ پوشاک اور اونچی ایڑی کا جوتا پہنے ہوئے ہمارے پاس آیا۔ اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھورے تھے اور چہرہ بہت گورا اور صاف تھا۔ اس نے مجھ کو اس طرح سے دیکھا جیسے انگریز دیکھتے ہیں۔ میں نے اس کو انگریز سمجھ کر اس سے بات کرنا چاہا تھا کہ اتنے میں وہ مڑ کر میرے مسلمان نوکروں کے پاس جا بیٹھا۔ معلوم ہوا کہ یارقند کا رہنے والا ایک حاجی تھا۔ جب ہم روکشین میں پہنچے تو وہاں کے مسلمانوں سے قرآن و مذہب کی نسبت بہت سی گفتگو ہوئی۔

عیسائیوں کو وہ نصاریٰ کہتے ہیں اور مسلمانوں کی بہ نسبت کچھ ہی کم سمجھتے ہیں کیونکہ عیسائی اہل کتاب ہیں اور ان کے لیے توریت موسیٰؑ اور زبور داؤدؑ اور انجیل عیسیٰؑ بھیجی گئی ہے' اور ان کے خاص پیغمبر یعنی حضرت عیسیٰؑ درجے میں محمد ﷺ سے دوسرے ہیں۔ ہندو اور آذر بت پرستوں کو ایسا نہیں سمجھتے۔ اسی مقام پر محمد نذر سے جو یارقند کا ایلچی ہندوستان میں آیا تھا ملاقات ہوئی۔ اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے میرے ساتھ چائے پی اور رخصت ہوئے۔

مردہ رائے یا زندہ حقیقت

ہر ایک شخص کو گو اس کی رائے کیسی ہی زبردست اور مضبوط ہو اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضا مندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بے باکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا تو وہ ایک مردہ اور مردار رائے قرار دی جاوے گی، نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت۔ اور وہ کبھی ایسی حق اور سچ بات قرار نہیں پا سکتی جس کا اثر ہمیشہ لوگوں کی طبیعتوں پر رہے۔

(آزادی رائے)

عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے۔ اگر تمثیلاً" کہا جاوے کہ عورت انسان کے لیے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپے کے تو بھی اس پر راضی نہ ہوتے۔ بااین ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی کا بڑا حامی کار ہے، جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لا -عقل اور لاشے سمجھا ہے۔

انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم الوجود متصور ہوتی ہے اور ذات شوہر سے مبدل ہو جاتی ہے۔

وہ کسی قسم کے معاہدے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لیے وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلا شوہر کی مرضی کے لکھی ہو ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔

جو ذاتی اسباب اور مال و نقد و جائیداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی کے بقبضۂ شوہر آجاتی ہے۔

جو جائیداد کہ عورت کو وراثتاً" قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو اس سب پر اس کا شوہر تا حین حیات، قابض ہو جاتا ہے اور وہی اس کا محاصل لیتا ہے۔

وہ مثل لا یعقل شخص کے نہ کسی پر دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی دعویٰ رجوع کر سکتا ہے۔

وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی اور کوئی چیز بیع نہیں کر سکتی۔

وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے خرچ کے جو ضروریات زندگی کے لیے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر مرضی شوہر کے نہیں کر سکتی۔

تہذیب الاخلاق

15 جمادی الاول 1288ھ

ذکر مسلمانی قانون کا نسبت عورتوں کے

اب خیال کرو کہ مسلمانی قانون میں عورتوں کو کس طرح عزت دی گئی ہے اور مردوں کے برابر ان کے حقوق اور اختیار تسلیم کیے گئے ہیں۔

حالت نابالغی میں جس طرح مرد اسی طرح عورت بے اختیار اور ناقابل معاہدہ متصور ہے، الا بعد بلوغ وہ بالکل مثل مرد کے مختار اور ہر ایک معاہدے کے لائق ہے۔

جس طرح مرد اسی طرح عورت اپنی شادی کرنے میں مختار ہے۔ جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا۔

وہ اپنی تمام ذاتی جائیداد کی خود مالک اور مختار ہے اور ہر طرح اس میں تصرف کرنے کا اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔

وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی ذات اور اس کی جائیداد ان معاہدوں اور دستاویزوں کی بابت جواب دہ ہے جو اس نے تحریر کی ہو۔

جو جائیداد قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت میں آئی ہو وہ خود اس کی مالک ہے اور خود اس کے محاصل کی لینے والی ہے۔

وہ مثل مرد کے دعویٰ بھی کر سکتی ہے اور اس پر بھی دعویٰ ہو سکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے اور جو چاہے اس کو بیع کرتی ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائیداد کو ہبہ اور وصیت اور وقف کر سکتی ہے۔

وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائیداد میں سے بہ ترتیب ورثہ پا سکتی ہے۔

وہ تمام گناہوں کے عوض میں دنیا اور آخرت میں وہی سزائیں پا سکتی ہے جو مرد پا سکتا ہے۔

کوئی قید خاص عورت پر بجز اس کے جو خود اس نے بسبب معاہدہ نکاح کے اپنے پر قبول کی ہیں یا اس تفاوت ستر عورت میں جو نیچر یعنی قدرت نے دونوں میں مختلف طور سے بنایا ہے ایسی نہیں ہے جو مرد پر نہ ہو۔ پس حقیقت میں مذہب اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے ویسا نہ کسی مذہب میں ہے اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے۔

مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات میں ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ملک کی عورتوں کی حالت مسلمانوں اور مسلمان ملک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے، حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہیے تھا۔

تہذیب الاخلاق

15 جمادی الاول 1288ھ

عزت

بہت کم لوگ ہیں جو اس کی حقیقت جانتے ہوں اور بہت کم ہیں جو اس کے مشتقات کے معزز القابوں کے مستحق ہوں۔ جس کی لوگ بہت زیادہ آؤ بھگت کرتے ہیں اس کو لوگ معزز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے۔ دولت، حکومت، ظاہری طمطراق خواہ نخواہ لوگوں کو معزز بنا دیتی ہے۔ وہ خود بھی آپ کو معزز سمجھتے ہیں اور لوگ بھی ان کو معزز جانتے ہیں۔ اوصافِ ظاہری بھی ایک ذریعہ معزز ہونے اور معزز بننے کا ہے جو دولت اور حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ ان کو معزز بنا دیتا ہے، مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا جیسے کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو اس وقت تک در حقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک اس کی اندرونی حالت بھی عزت کے قابل نہ ہو وہ معزز نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کو کسی انسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل اور قریب ناممکن کے ہے۔ پس ان کا کسی کو معزز سمجھنا در حقیقت اس کے معزز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ ہاں وہ شخص بلاشبہ معزز ہے جس کا دل اس کو معزز جانتا اور معزز سمجھتا ہو جس کو انگریزی میں 'سیلف ریسپکٹ' کہتے ہیں۔ کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچی بنا کر کہتا ہے تو خود اس کا دل اس کو ٹوکتا ہے کہ یہ سچ نہیں ہے، گو سننے والا اس کو سچ سمجھتا ہو، مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا اور بے عزتوں میں کا ایک بے عزت ہے۔

اسی طرح تمام افعال انسان کے جو صرف ظاہری نمائش کے طور پر کیئے جاتے ہیں، گو لوگ ان کی عزت کرتے ہوں، مگر در حقیقت وہ عزت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزت کے لائق وہی کام ہیں جن کو دل بھی قابل عزت سمجھے۔ اس لیے انسان کو انسان بننے کے لیے ضروری ہے کہ تمام اس کے کام سچائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں جس کو ہمارا دل جھٹلاتا ہو۔ ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس کی ہمارا دل عزت نہ کرتا ہو۔ کسی سے ہم اظہار دوستی اور محبت کا نہ کریں اگر در حقیقت ہمارے دل میں اس سے ویسی ہی محبت اور دوستی ہو جیسی کہ

اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کو ہمارا دل اچھا نہ سمجھتا ہو۔ صلح کل ہونا اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ سب سے اس طرح ملیں کہ ہر شخص جانے کہ ہمارے بڑے دوست ہیں تو یہ تو نفاق اکبر ہے اور ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اس کا دوست ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ کسی سے بغض، عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھے، کسی کا برا نہ چاہے، دشمن کی بھی برائی نہ چاہے، وہ بلاشبہ تعریف کے قابل ہے۔

تہذیب الاخلاق
یکم صفر 1313ھ

غلامی

آزادی اور غلامی آپس میں ایسی نقیض ہیں کہ نہ دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے اور نہ دونوں کا ارتفاع، اور اس لیے یہ دونوں داخل مرضی پروردگار نہیں ہو سکتیں ورنہ خود پروردگار کی مرضی میں تناقض لازم آوے گا جو اس کی حکمت بالغہ کے شایاں نہیں ہے۔ پس کچھ شبہ نہیں ہے کہ ان دونوں میں س صرف ایک ہی پروردگار کی مرضی کے مطابق ہو گی، یا یوں کہو کہ قانون قدرت دو نقیضوں کا متقاضی نہیں ہو سکتا اور اس لیے ان میں سے ایک ہی مقتضائے قانونِ قدرت ہو گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ایک ایسی ہستی بنایا گیا ہے جس کی فطرت میں آزادی اور خود مختاری رکھی گئی ہے۔ وہ ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ اس کو تمام قوائے ظاہری و باطنی دیے گئے ہیں، ان کے استعمال پر جس طرح کہ وہ چاہے قادر ہے۔ تمام کاموں کے شروع کرنے کی سمجھ اور ان کے انجام کی سوچ اس کو دی گئی ہے، تاکہ ہر کام کا آغاز اور انجام سوچ لے۔ اس کی فطرت ایسی ہے کہ اپنے لیے آپ تمام چیزیں مہیا کرنے کے لیے حاجت مند ہے۔ پس یہ تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس پُتلے کے صانع کی مرضی یہی تھی کہ یہ پُتلا خود اپنا آپ مالک رہے۔

صانع نے یہ تمام قویٰ جو انسان کو عطا فرمائے ہیں ان سے اس کی مرضی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ تمام قویٰ انسان میں اس طرح پر شگفتہ و شاداب رہیں کہ اعتدال سے خارج نہ ہونے پاویں اور ایک دوسرے کی نقیض نہ ہو جاویں۔ انسان کی ذاتی محنت اسی کے لیے سود مند ہو۔ غلامی کی حالت میں انسان کے بہت سے قوا بعوض شگفتہ و ترو تازہ رہنے کے پژمردہ، بلکہ محض معطل و بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی محنت اس کی سود مندی کے لیے نہیں رہتی۔ پس کسی طرح ایسی حالت صانع کی مرضی نہیں ہو سکتی۔

انسان کی وہ چیز جس سے انسان انسان کہلاتا ہے اور جس کا نام لوگ روح لیتے ہیں، مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں بتلا سکتے، ایسی شریف چیز ہے کہ کسی کی مملوک ہونے کی لیاقت ہی نہیں

رکھتی۔ کیا نتائج قانون قدرت یا خدا کی روح یا امر رب کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے؟ کیا ہم سی ہی ایک مخلوق ہماری ملکیت میں آسکتی ہے؟ حاشا و کلا۔ پس صاف عیاں ہے کہ غلامی اس قادرِ مطلق کی مرضی اور قانون قدرت دونوں کے برخلاف ہے۔ تمام انسان آزاد اور یکساں پیدا ہوئے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ زندگی اور آزادی اور خوشی حاصل کرنے میں یکساں اور غیر قابل انتقال استحقاق رکھتے ہیں۔

(تہذیب الاخلاق 15 جمادی الاول 1288ھ

م 1871ء

رسوم و عادات

سب سے مقدم اور سب سے ضرور امر اس کام کے لیے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور ان تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سننے اور کرنے سے روکتے ہیں خالی کریں اور اس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا برائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں۔

یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم اور دوسرے ملک دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہیے' تاکہ جو رسم و عادت ہم میں بھلی ہے اس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بُری ہے اس کے چھوڑنے پر کوشش کریں' اور جو رسم و عادت دوسروں میں اچھی ہے اس کو بلا تعصب اختیار کریں اور جو ان میں بری ہے اس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔

جبکہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں جو رسوم و عادات مروج ہیں انہوں نے کس طرح ان قوموں میں رواج پایا ہے تو باوجود مختلف ہونے ان رسومات و عادات کے' ان کا مبداء اور منشاء متحد معلوم ہوتا ہے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروج ہیں ان کا رواج یا تو ملک کی آب و ہوا کی خاصیت سے ہوا ہے' یا ان اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً" فوقتاً" .ضرورت تمدن و معاشرت کے پیش آتی گئی ہے' یا دوسری قوم کی تقلید و اختلاط سے مروج ہو گئی ہیں' یا انسان کی حالت ترقی یا تنزل نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہرا" یہی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم و عادات کے مروج ہونے کا مبداء و منشاء معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات کہ مقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں ان کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں' کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے ان کو سکھلائی ہیں جس کے سچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں' مگر صرف ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔

مثلاً" ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے۔ پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی

قوموں میں ہے۔ مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ کے استعمال کے لیے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں ہندسی قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی گرمی سے فائدہ اٹھاویں یا مٹی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھریں جس سے گورا گورا پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریق تمدن و معاشرت روز بروز انسانوں میں ترقی پاتا جاتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں و عادتیں جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں ان میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور اگر ہم اپنی ان پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بمقابل ان قوموں کے جنھوں نے ترقی کی ہے، ہم ذلیل اور خوار ہوں گے

دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے، مگر جب وہ رسمیں اندھے پنے سے صرف تقلیداً" بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں، دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں تو اس قوم سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس لیے کہ ہم کو اس رسم سے موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اس کی حقیقی بھلائی یا برائی پر غور کرنے کا، بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں، بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسم جاری ہے ہم کو بہت عمدہ مثالیں سینکڑوں برس کے تجربے کی ملتی ہیں جو اس رسم کے اچھے یا برے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔

آزادی رائے

ہم اپنے اس آرٹیکل کو ایک بڑے لائق اور قابل زمانۂ حال کے فیلسوف کی تحریر سے اخذ کرتے ہیں۔ رائے کی آزادی ایک ایسی چیز ہے کہ ہر ایک انسان اس پر پورا پورا حق رکھتا ہے۔ فرض کرو کہ تمام آدمی بجز ایک شخص کے کسی بات پر متفق الرائے ہیں، مگر صرف وہی ایک شخص ان کے بر خلاف رائے رکھتا ہے تو ان تمام آدمیوں کو اس ایک شخص کی رائے کو غلط ٹھہرانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ استحقاق نہیں ہے جتنا کہ اس ایک شخص کو ان تمام آدمیوں کی رائے کے غلط ثابت کرنے کا (اگر وہ ثابت کر سکے) استحقاق حاصل ہے۔ کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ پانچ آدمیوں کو تو بمقابلہ پانچ آدمیوں کی رایوں کے غلط ٹھہرانے کا استحقاق ہو اور ایک آدمی کو بمقابل نو آدمیوں کے یہ استحقاق نہ ہو۔ رائے کی غلطی آدمیوں کی تعداد کی کمی بیشی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ قوتِ استدلال پر منحصر ہے، جیسے کہ یہ بات ممکن ہے کہ نو آدمیوں کی رائے بمقابلہ ایک شخص کے صحیح ہو ویسے ہی یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے بمقابل نو کے صحیح ہو۔

رایوں کا بند رہنا خواہ بسبب کسی مذہبی خوف کے اور خواہ بسبب اندیشہ برادری و قوم کے اور خواہ بدنامی کے ڈر سے اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے نہایت ہی بری چیز ہے۔ اگر رائے اس قسم کی کوئی چیز ہوتی جس کی قدر و قیمت صرف اس رائے والے کی ذات ہی سے متعلق اور اسی میں محصور ہوتی تو رایوں کے بند رہنے سے ایک خاص شخص کا یا معدودے چند کا نقصان متصور ہوتا، مگر رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کُل انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو، بلکہ ان کو بھی جو آئندہ پیدا ہوں گے۔

اگرچہ رسم و رواج بھی اس کے بر خلاف رایوں کے اظہار کے لیے ایک بہت قوی مزاحم کار گنا جاتا ہے، لیکن مذہبی خیالات مخالف مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لیے نہایت قوی مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس مخالف رائے کا اظہار ہونا ان کو ناپسند ہوا ہے، بلکہ اسی کے ساتھ جوشِ مذہبی اُمنڈ آتا ہے اور عقل کو

سلیم نہیں رکھتا اور اس حالت میں ان سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں جو ان ہی کے مذہب کو جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پہنچاتے ہیں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ مخالفوں کے اعتراض لامعلوم رہیں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے ان ہی کے مذہب کے لوگ ان کے حل پر متوجہ نہ ہوں' اور مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کیے اور بلا دفع کیے باقی رہ جاویں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلیں بسبب نا تحقیق باقی رہ جانے ان اعتراضوں کے جس وقت ان اعتراضوں سے واقف ہوں اسی وقت مذہب سے منحرف ہو جاویں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے۔ اگر انہی کے مذہب کا کوئی شخص بغرضِ حصولِ اغراضِ مذکورہ ان کو پھیلانا چاہے تو خود اس کو معترض کی جگہ تصور کرتے ہیں اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔

کیا عمدہ رائے اس فلیسوف کی ہے کہ "کسی رائے کے حامیوں کا اس رائے کے برخلاف رائے کے مشتہر ہونے میں مزاحمت کرنے سے خود ان حامیوں کا بہ نسبت ان کے مخالفوں کے زیادہ تر نقصان ہے' اس لیے کہ اگر وہ رائے صحیح و درست ہو تو اس کی مزاحمت سے غلطی کے بدلے صحیح بات حاصل کرنے کا موقع ان کے ہاتھ سے جاتا ہے اور اگر وہ غلط ہے تو اس بات کا موقع باقی نہیں رہتا کہ غلطی اور صحت کے مقابلے سے جو صحت کو زیادہ استحکام اور اس کی سچائی زیادہ تر دلوں پر موثر ہوتی ہے اور اس کی روشنی دلوں میں بیٹھ جاتی ہے' اس نتیجے کو حاصل کریں جو فی الحقیقت نہایت عمدہ فائدہ ہے۔"

کچھ شبہ نہیں ہے کہ عموماً" مخالف اور موافق رایوں کا پھیلنا اور منتشر ہونا" خواہ وہ دینی معاملے سے علاقہ رکھتی ہوں یا دنیوی معاملے سے نہایت ہی عمدہ اور مفید ہے۔ دونوں قسم کی رایوں پر جدا جدا غور کرنے کا موقع ملتا ہے کہ ان میں سے کون سی بہتر ہے یا ان دونوں کی تائید ایسے دلائل سے ہوتی ہے جو جداگانہ ہر ایک کے مناسب ہیں۔ ہم کو اس بات کا کبھی یقین کامل نہیں ہو سکتا کہ جس رائے کی مزاحمت میں یا بند رہنے میں ہم کوشش کرتے ہیں وہ غلط ہی ہے' اور اگر یقین بھی ہو کہ وہ غلط ہے تو بھی اس کی مزاحمت اور اس کا انسداد برائی سے خالی نہیں۔

تہذیب الاخلاق

20 ذی قعدہ 1287ء

اپنی مدد آپ

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادت، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے، کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب در حقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے، جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے، شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بد چلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، در حقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں، تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زو شور سے پیدا ہو جاویں گی، جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو، تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا، بات چیت کا، وضع و لباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل اشغال کا، تمہاری اولاد کے لیے ہے، اس سے ان کی شخصی چال چلن، اخلاق و عادات، نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا وکلا

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے...

مستقل اور مضبوط آزادی، سچی عزت، اصلی ترقی، شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن معاشرت و تمدن کا محافظ اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مل جو اسی زمانے میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے، اس کا قول ہے کہ ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے...

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے، گورنمنٹ فیاض ہو

اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں' جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے...

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط (اصول) جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے' تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے۔ اوروں پر بھروسا اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں...

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں' زمین کے جوتنے والوں' کانوں کے کھودنے والوں' نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں' مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں' ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں' ہنر مندوں' شاعروں' حکیموں' فیلسوفوں' ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجہ (تک) پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں' لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائیداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائیداد ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار سر گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں' بلکہ ہم کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بھی گرا دیا۔

تہذیب الاخلاق

یکم شعبان 292 / ھ

انسان و حیوان

دین دار کہتے ہیں کہ انسان خاص عبادت کے لیا بنایا گیا۔ اگر عبادت کے یہ معنی ہیں کہ مخلوق وہ کرے جس کے لیے بنایا گیا ہے تو تو شجر و حجر' آب و خاک' آتش و ہوا' چرند و پرند سے زیادہ انسان عابد نہیں ہو سکتا۔

قومی ہمدردی بھی حیوانوں میں پائی جاتی ہے' پس قومی ہمدردی بھی انسان کی خاصیت نہیں ہے۔

ہاں ایک بات انسان میں ہے جو حیوان میں نہیں کہ وہ قومی ہمدردی کے ساتھ اس قومی ضرورت کا تدارک بھی کر سکتا ہے' مگر حیوان نہیں کر سکتا۔ پس جو انسان کہ قومی ہمدردی نہیں کرتے وہ تو حیوانیت سے بھی خارج ہیں اور جو ہمدردی کی صرف باتیں بناتے ہیں اور عملی طور پر اس کو کام میں نہیں لاتے وہ ان جانوروں کی مانند ہیں جو کائیں کر کے جمع تو ہو جاتے ہیں' مگر کچھ کرتے نہیں

تہذیب الاخلاق
جمادی الثانی 1297ھ

کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے

سرسید اپنے عہد کے مسلمانوں کی معاشرتی حالت دیکھ کر تہذیب اور اصلاح کی شدید ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کے رسالے کے نام تہذیب الاخلاق سے ہو سکتا ہے۔

اختصار اور ضرورت کے پیش نظر ہم نے اصلاح کے جن شعبوں کو حذف کر دیا ہے وہ یہ ہیں

چہارم	تدقیقِ بعض مسائلِ مذہبی
پنجم	تصحیح بعض مسائلِ مذہبی
بستم	طرز لباس
بست و یکم	طریقِ اکل و شرب
بست و چہارم	کثرت ازدواج
بست و پنجم	غلامی

طرز لباس و طریق کل و شرب کے سلسلہ میں ہمارے معاشرے کی دنیا بدل گئی ہے۔ غلامی قصہ دیروز ہو گئی اور فقہی و مذہبی مسائل میں الجھنے کا دور بڑی حد تک گزر گیا۔ اس کے علاوہ سرسید کے بعض خیالاتِ مذہبی اب زندہ حوالہ نہیں ہیں

مرتب

جبکہ ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں تو ہم کو ضرور ہے کہ ہم یہ بھی بتادیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہیے۔

اول، آزادیِ رائے۔ مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں جس کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہو گی اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

دوم، درستی عقائد مذہبی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں اور، جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقائد کو سنت اسلام کے مطابق کرنا اور اسی پر یقین رکھنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

سویم، خیالات، و افعال مذہبی - ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں، حالانکہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خود بدعت ہیں یا رسومات و خیالات کفر و شرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لیے ان کی تہذیب درکار ہے۔

ششم، تعلیم اطفال - مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گذشتہ اور حال پر نظر کر کر ایک ایسا طریقہ تعلیم معین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔

ہفتم، سامان تعلیم۔ ہمارے لیے صرف طریقہ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہو گا، بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کر دینا ضرور ہو گا۔

ہشتم، عورتوں کی تعلیم۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ان کو دستکاری سکھلانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

نہم، ھنر و فن حرفہ۔ اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا و ترقی دینا قومی تہذیب کے لیے ایک بہت بڑا جزو ہے۔

یہ تمام باتیں وہ تھیں جو مجموعاً و منفرداً ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی تھیں۔

اب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہر ایک شخص کی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں، مگر ان کا اثر کل قوم پر ہوتا ہے اور ہر ایک میں ان باتوں کے ہونے سے قومی تہذیب و شائستگی قرار پاتی ہے۔

دھم، خود غرضی - سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی...

یازدھم، عزت اور غیرت - غیرت اور عزت یہ دونوں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہیں کہ کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزت ہے اس کو غیرت ہے، جس کو غیرت ہے اس کو عزت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں کی کمی کیا، بلکہ وہ معدوم ہو گئی ہیں۔ اگرچہ میری اس بات سے لوگ متعجب ہوں گے کہ مسلمان کیونکر ایسے ہیں، اگر ابھی ان کو کوئی گالی دے، جان نکال لیں، مر جائیں پر اپنی شان نہ جانے دیں۔ شادی مہمانی میں ہرگز ناک کٹائی نہ ہونے دیں۔ روپیہ قرض لیں اور شادی دھوم سے کریں۔ اگر باوا مرگیا ہے تو اس کی فاتحہ اور چہلم کی تودہ بندی میں کبھی دریغ نہ کریں، پھر کیونکر ان کو اپنی عزت یا غیرت کا خیال نہیں ہے۔

... مگر یہ سب شیطانی اور جھوٹی عزت اور غیرت ہے... کس کو اس بات کی غیرت ہے کہ ہم کو کوئی جھوٹا خیال (نہ) کرے۔ کس کو اس بات کا خیال ہے کہ ہم آپس میں اور معمولی باتوں میں بھی سچ کی عزت پر بٹا نہ لگائیں...

دوازدھم، ضبط اوقات - ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنے خاص اوقات کا اور جو کام عام قوم سے متعلق ہیں ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔

سیزدھم، اخلاق۔ بالفعل مدار اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جس کسی سے ملے کچھ ہنس کر سلام کیا، کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں، دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں، کچھ اپنی جھوٹی نیاز مندی کا اظہار کیا، کچھ ان کی جھوٹی تعریف کی، آؤ بھگت کی اور دل میں کہا کہ خوب الو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو یا تو برا کہنے لگے یا جو باتیں کی تھیں ان کا نقش بر آب کا سا بھی نشان نہ تھا۔

یہ سب باتیں انسان کے دل کو اور اس کے اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں۔ بلاشبہ ہم کو سب سے جھک کر اور خندہ پیشانی سے ملنا چاہیے، مگر وہیں تک جہاں تک کہ انسانیت کا مقتضا ہے، مگر اس کو مکاری کی حد تک نہ پہنچانا چاہیے۔

چہاردہم' صدق مقال - یہ تو وہ صفت ہے کہ جو انسان کو قطب و ابدال کے درجے سے بھی بڑھا دیتی ہے' مگر یہاں ہمارا مطلب دنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے۔ ضرور ہے کہ سب لوگ سچ میں عزت سمجھیں۔ ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے تاکہ قایل کو قبل کلام اس بات کی غیرت ہو کہ سامع میرے اس قول کو جھوٹ نہ سمجھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ آپس میں ایک دوست دوسرے کو کہتا ہے کہ میاں کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ ان باتوں سے جھوٹ کے عیب اور جھوٹ کے طعنے کی غیرت دل سے جاتی رہتی ہے جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب اور ناشائستہ ہونے قوم کا ہوتی ہے۔

پانزدہم' دوستوں سے راہ و رسم - ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں' بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا امر ضروری ہے۔

شانزدہم' کلام۔ طرز گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب و شائستگی کا ہے جس کی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں نہایت کم مستعمل ہیں اور اس لیے اس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔

ہفتدہم' لہجہ - اس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکھڑ لہجہ یا اس قسم کی آواز جس سے شبہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا جانور لڑتے ہیں' ناشائستہ ہونے کی نشانی ہے۔ کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

ہیرژدہم' طریق زندگی - یہ تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریق زندگی ہمارے طریقہ زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

نوزدہم' صفائی __ بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ خدا اور خدا کے بعد صفائی۔ مسلمانوں کے ہاں بھی حدیث ہے کہ "الطہور شطر الایمان" مگر ہم مسلمان بہت کم اس کی طرف متوجہ ہیں' صورت دیکھو تو واہ واہ' گھر دیکھو تو سبحان اللہ' اس لیے ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بھی بڑی ضرورت ہے۔

بست و دوم __ تدبیر منزل - ہماری تدبیر منزل' یعنی انتظام خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے جس میں نہایت درجے کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

بست و سوم' رفاہ عورتوں کی حالت میں۔ غیر قوموں نے ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ

جیسا کچھ خیال کیا ہے اور لکھا ہے اس میں یقینی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں ہیں، مگر جو اصلی حالت عورتوں کی بلاشبہ ترقی کے لائق ہے اور ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔

بست و ششم، رسومات شادی۔ جو رسومات شادی کی ہم مسلمانوں میں رائج ہیں، ایک بھی ان میں سے مذہب اسلام کی رسم نہیں ہے اور جیسی نالائق اور نامہذب وہ رسمیں ہیں شاید ہی اور کوئی رسم اس سے زیادہ ناشائستہ اور نامہذب ہوگی۔

بست و ہفتم، رسومات غمی - اسی طرح رسومات غمی کا حال ہے کہ برخلاف مذہب اسلام کے ہم نے نامہذب و ناشائستہ رسمیں اختیار کرلی ہیں۔

خدا رحمت کرے مولوی اسماعیل پر جن کی بدولت بہت سی نامہذب و ناشائستہ رسمیں شادی و غمی کی ہم میں سے چھوٹ گئی ہیں، مگر اس پر بھی بہت کچھ باقی ہیں جن کی تہذیب پر ہم کو متوجہ ہونا چاہیے۔

بست و ہشتم، ترقی زراعت - زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی حالت کی بہتری قومی ترقی اور تہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے اور اس میں ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔

بست و نہم، تجارت - یہ سب سے آخر جزو ہے قومی ترقی اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا اور ہم مسلمانوں میں یہ امر بالکل متروک ہوگیا ہے۔ پس ہم کو اپنی قوم میں اس کا رواج دینا اور عمدہ اصولوں پر اس کو قائم کرنا ایک بہت بڑا امر واسطے تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا ہوگا۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یہ تمام دنیا کی چیزوں کی ترقی ہم سے کیونکر ہو سکتی ہے، اس لیے کہ اگر ہم متوجہ ہوں گے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے پر دل لگاویں گے تو سب کچھ ہم سے ہو سکے گا۔ یہ باتیں ظاہر میں بہت سی معلوم ہوتی ہیں، لیکن آپس میں ایک دوسرے سے ایسا علاقہ رکھتی ہیں کہ جب ایک بات میں ترقی ہوتی ہے تو ہر ایک بات میں از خود ترقی ہوتی جاتی ہے، پر کوشش شرط ہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

تہذیب الاخلاق

یکم ذی الحجہ 1287ھ

افسوس مسلمانوں کے حال پر

ناصر الاخبار دہلی نے قسطنطنیہ کے اخبار سے کچھ حال بیت المقدس کے مسلمانوں کا لکھا ہے۔ ہم بھی اس کو اپنے پرچے میں نقل کرتے ہیں' اس مراد سے کہ ہمارے بھائی ہندوستان کے مسلمان اس پر غور کریں اور اپنی قوم کی بھلائی و بہتری و ترقی کی کوشش کریں۔ دیکھو تمام دنیا کے مسلمانوں کا اور ان کا بھی جو خود مسلمان بادشاہت میں رہتے ہیں تعصب و جہالت و نادانی اور کم فہمی سے کیا حال ہو گیا ہے اور آئندہ کیا حال ہونے والا ہے۔ پس اب کون سی ذلت اور خواری باقی ہے جس کے آنے کی خوشی میں بیٹھے ہو۔ دیکھو خبردار ہو' ہوشیار ہو' جو راہ ہم نے مدرستہ العلوم قائم کرنے اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی سوچی ہے وہی راہ ان کی بھلائی کی ہے۔ دیکھو اس کی امداد سے غافل نہ ہو' کوشش کرو اور دل و جان سے اس کے لیے چندہ جمع کرو۔ دیکھو ہماری ناچیز کوششوں سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سے سے زیادہ چندہ ہو گیا ہے۔ اگر اور لوگ بھی دل سے کوشش کریں اور باہمی نفاق اور اختلاف کو نکال ڈالیں تو مسلمانوں کے حق میں زیادہ تر مفید ہو گا۔ کیا تعجب کی بات ہے کہ جو کوئی یہ خیال کرے کہ اگر مجوزہ مدرستہ العلوم قائم نہ ہوا تو سید احمد کو خفت ہو گی۔ سید احمد کو خفت ہو یا نہ ہو' اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو تو منہ دکھانے کی جگہ نہیں رہنے کی اور یہ بھی ہم اپنی عزیز قوم کو سمجھائے دیتے ہیں کہ اگر یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور انجام کو نہ پہنچی تو یقین جان لینا کہ پھر کبھی مسلمانوں کی بھلائی و بہتری کی توقع نہیں ہونے کی۔ پس یہ اخیر دوا ہے' خدا کو مانو' اس کو ہونے دو۔ اپنی قوم کے حق میں اپنے ہاتھوں کانٹے مت بوؤ۔ اگر مسئلہ مسائل میں بحث ہے یا مخالفت ہے تو ہم سے' مدرستہ العلوم کو اس سے کیا تعلق ہے۔ گنہگار ہوں تو میں ہوں' تقصیروار ہوں تو میں۔ تمام مسلمانوں نے اور ان کی اولاد نے اور خود تمہاری اولاد نے تمہارا کیا قصور کیا ہے جو مدرستہ العلوم کی مخالفت سے یا اس میں مدد نہ کرنے سے ان کے ساتھ دشمنی کرتے ہو۔

تہذیب الاخلاق' یکم ربیع الثانی 1291ھ

تعصب

انسان کی بد ترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بد ترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بد خصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے، مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی میں ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے، بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا، کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے، مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہل مذہب کے لیے ہو سکتی ہے اور تعصب، گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو نہایت برا اور خود مذہب کو نہایت نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب، مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے، اس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے مخالفوں اور معترضوں اور برا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور خود بھی اس کے دفعیے پر مستعد ہوتا ہے اور اور لوگوں کو بھی اس کے دفعیے کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب، نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلی بسم اللہ ایسی بد خصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقل مند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے، اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ

لگتا ہے۔ اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے بدلے الٹا اس کا حارج قوی ہوتا ہے۔ اپنے تعصب کے سبب بداخلاق اور مغرور اور متقشف سخت دل ہو جاتا ہے اور ٹھیک ٹھیک اس آیت کریمہ لو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک سے مخالفت صریح کرتا ہے۔

مذہب میں متعصب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سنتا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا اور اس سبب سے "نمنا" وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کیے اور بلا جواب دیے باقی رہ جاویں۔ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے۔ پس یہ تمام باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں ہیں، بلکہ مخالفوں کی فتح یابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرضکہ تعصب خواہ دینی ہو یا دنیاوی باتوں میں، نہایت برا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

تہذیب الاخلاق

یکم شوال 1287ھ

بحث و تکرار

جب کُتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور نحیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اِس کی ٹانگ اُس کی کمر میں، اُس کا کان اِس کے منہ میں اور اِس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے "واہ تم کیا جانو" وہ بولتا ہے "تم کیا جانو" دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتی ہیں۔ عف عف کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اِس کی گردن اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اِس کی مٹھی میں۔ لپاڈوگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں توں تکار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزر جاتی ہے، مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا

اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ بھی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے، مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

تہذیب الاخلاق

صفر 1290ھ

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا ہی پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چُبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جاملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی اس قدر قدر کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے، اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینے پن سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جبکہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ در حقیقت ہم نہیں ہیں ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے۔ حوالے کرتے ہیں جو

اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینے شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں، مگر در حقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بد زیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں، کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک روتی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کلائی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے۔ جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے، دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے، مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال، خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے، بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی، بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا، مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔

فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجے سے اوپر ہیں انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

تہذیب الاخلاق

یکم ذی الحجہ 1289ھ

ریا

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ دنیادار اور رند مشرب آدمی جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں اس سے زیادہ اپنے تئیں بد بناتے ہیں۔ دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں۔ وہ تو دینداری کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں اور دن رات عشق و تماش بینی اور لچ پنے کی باتوں کی جن کو دراصل انہوں نے کیا بھی نہیں گپیں اڑاتے ہیں اور یہ حضرت بے شمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہری دینداری کے پردے میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں برے نہیں ہیں، مگر ایک او تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں اور انہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی بناوٹ ایک اور ہی عجب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے، بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکے میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود ان سے انہیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے۔ جس قدر کہ در حقیقت وہ نیک ہیں اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ پھر وہ لوگ یا اپنی بدیوں پر خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داوٗدؑ نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اس طرح پر خدا کی مناجات کی ہے "کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر۔" جو لوگ علانیہ بدی کرتے ہیں اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کے لیے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ جو درحقیقت موت کی راہ پر چلتے ہیں اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے رستے پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں۔ پس میں چند قاعدے بیان کرنا چاہتا ہوں جن سے وہ بدیاں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوتی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان خود اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا معلوم ہو سکیں۔

عام قاعدہ تو اس کے لیے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو ان مذہبی اصولوں سے جو ہماری ہدایت کے لیے مقدس کتاب اللہ میں لکھے ہیں جانچیں اور اپنی زندگی کو اس پاک شخص کی زندگی

سے مقابلہ کریں جس نے یہ فرمایا "انا بشر مثلکم یوحٰی الی انما الھکم الہ واحد" اور جو اس درجہ کمال تک پہنچا جہاں تک انسان کا پہنچنا ممکن ہے اور جس کی زندگی ہماری زندگی کے لیے نمونہ ہے، اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لیے، بلکہ تمام دنیا کے لیے بڑا ہادی اور بہت بڑا دانا استاد ہے۔ ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی بڑی غلطیاں پڑتی ہیں۔ کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا، اور کچھ زمانے کے گزرنے سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت ان واقعات کی جو گزرے معلوم نہیں ہو سکتی، اس لیے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان کرنے پر میں اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں جو انسان کو ٹھیک ٹھیک مطلوبہ راہ پر لے آتے ہیں۔

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے دل کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں۔ یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی نہیں معلوم ہوتے اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ ہم ان کو نہایت ہی خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈ کر ہمارے عیب نکالتا ہے۔ گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت بڑا کر دیتا ہے، مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے۔

تا نباشد چیزکے، مردم نگویند چیزہا

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو، اس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیے تھا۔

دشمن جو عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے ہمارے فائدے سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہوتا ہے تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو خدا کا شکر کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ "دشمن از دوست ناصح تراست، ایں جز نکوئی نگوید و ایں جز بدی نجوید"

پلوٹارک کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے اس میں اس نے یہ بات لکھی ہے کہ دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں اور ہماری گفتگو میں اور

ہمارے چال چلن میں اور ہماری تحریر میں جو نقص ہیں وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے۔

علی ھذا القیاس اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں تو ہم کو اس بات پر غور کرنی چاہیے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں اس میں سے ہم کس قدر کے مستحق ہیں۔ اور پھر یہ سوچنا چاہیے کہ جن کاموں کے سبب وہ تعریف کرتے ہیں وہ کام ہم عمدہ غرض اور نیک نیتی سے دنیا کو فائدہ پہنچانے کے لیے کرتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ نیکیاں جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں دراصل ہم میں کہاں تک ہیں۔

تہذیب الاخلاق

15 شوال 1289ھ

ہندوستانیوں کا خون

جو تنبیہ حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر نے مسٹر فلر کے مقدمہ میں فرمائی اس کے بعد سے بجائے اس کے کہ ہمارے کان میں یہ صدا کم پہنچتی کہ فلاں ہندوستانی فلاں صاحب کے ہاتھ سے اور مارا گیا' برابر ہمارے کان میں یہ آواز پہنچتی رہی کہ آج ایک اور ہندوستانی کو فلاں یورپین نے ہلاک کر دیا اور یہ خبریں ہم کو اسی طرح پہنچتی ہیں جس طرح شکار کے موسم میں یہ خبریں پہنچتی ہیں کہ ایک صاحب نے ایک ہرن یہاں سے مارا' دوسرے صاحب نے ایک ہرن وہاں سے مارا۔ چنانچہ فلر صاحب کے مقدمہ کے بعد ایک خبر توپ خانہ کے صاحب کی پہنچی' جنہوں نے ایک پنکھا قلی کو مارے لاتوں کے جان سے ڈالا دوسری خبر ان صاحب کی پہنچی جنہوں نے ایک ملاح کو راہ گزار عالم بقا کیا۔ تیسری خبر لکھنؤ کے کے چوکی دار کی پہنچی جس کو شوقین گوروں نے بندوق سے شکار کیا۔ چوتھی خبر کراچی کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ٹیلیگراف کی پہنچی جنہوں نے ایک شخص کو مار ڈالا۔ پانچویں خبر گورکھ پور کے ایک تماشہ والا صاحب کی پہنچی جنہوں نے ایک شخص کو سرائے میں لٹھ مار کر ہلاک کیا۔ چھٹی خبر جہلم کے ایک صاحب ایلچی نامی کی ہے جو ملازم ریلوے ہیں اور انھوں نے ایک پنکھا قلی کے سر میں ایک ضرب شدید پہنچا کر اس کو ہلاک کیا۔ غرض کہ یہ چھ خبریں قتل کی ہیں جن میں چھ غریب ہندوستانی مقتول اور چھ صاحب بہادر قاتل ہیں اور جملہ مقدمات میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ ہوا۔

ہم کو ان تمام درد ناک خبروں کے سننے سے نہایت افسوس ہوا ہے اور وہ افسوس کچھ صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ بے چارے غریب ہندوستانی ایسی بے رحمی کے ساتھ مارے گئے اور ان کا خون ایک جانور کے خون بلکہ پانی سے بھی زیادہ بے قدری کے ساتھ بہایا گیا اور باوجود اس کے ہندوستانیوں کی فریاد کی کچھ شنوائی نہیں ہے۔ بلکہ بڑا سبب افسوس کا یہ ہوا کہ ہندوستان میں جس طرح ہندوستانیوں کی فریاد شنوائی کے لائق نہیں ہے اسی طرح شاید ہمارے حضور گورنر بہادر کے احکام کی بھی شنوائی نہیں ہوتی کیوں کہ اگر ان کی شنوائی ہوتی تو اس کا اثر یہ ہوتا کہ ہمیشہ کے واسطے نہیں تو چند روز کے واسطے تو ضرور ہی ہندوستانیوں کو اس سختی سے نجات ملتی اور

کچھ تو ہمارے ملک کے حاکم متنبہ ہوتے' نہ کہ برخلاف اس کے برابر قتل ہو رہا ہے اور کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ کیا کسی کے نزدیک یہ امر کچھ انصاف سے بعید نہیں ہے کہ انگریزی عمل داری میں انسان جانوروں کی طرح مارے جاتے ہیں۔ کیا یہ وہی فعل نہیں ہے جس کے سبب سے مشرقی سلطنتیں آج تک ظالم مشہور ہیں اور ان کی بدنامی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ کیا ان کی نسبت یہی نہیں کہا جاتا تھا کہ ان کے عہد میں رعایا کی جان و مال کی حفاظت نہ تھی۔ ان کے جیل خانے خراب تھے۔ ان کے کار پرداز خود غرض اور ظالم تھے۔ پس کیا اے انصاف پسند لوگو! اب انگریزی عمل داری کو یہ حرکتیں بدنام نہیں کریں گی۔ کیا غریب ہندوستانی اسی طرح کام میں آویں گے کہ ہمیشہ صاحب لوگوں کے گھونسوں اور لاتوں اور رولوں سے پٹ کر جان دیں گے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔ سلاطین مشرقیہ کے زمان میں جو حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہو گا۔ سلاطین مشرقیہ کے زمان میں جو حفاظت جان کی نہ تھی اس کے کچھ یہ معنی نہ تھے کہ سلاطین اپنے ہاتھ سے ہمیشہ لوگوں کو قتل کر ڈالتے ہوں یا علی الصباح بطور تماشا دو چار کو قتل کا حکم دے دیتے ہوں بلکہ ان کے عہد میں بعض ظلم پسند ایسی حرکات کا باعث ہوتے تھے اور جب ان سے کچھ بازپرس نہ ہوتی تھی تو ان کی جرات بڑھتی تھی۔ اسی طرح اب یہ کیفیت ہے کہ غریب ہندوستانی برابر مارے جاتے ہیں اور قاتلوں کو چنداں عبرت نہیں ہوتی جس سے خود وہی آئندہ کو باز آویں یا ان کو دیکھ کر اور کسی کو عبرت ہو بلکہ جس وقت حضور لارڈ لٹن صاحب بہادر کی تنبیہ کی نسبت ہائی کورٹ نے اعتراض کیا ہے اس وقت سے یہ بھی امید نہیں ہے کہ کچھ بازپرس ہو گی کیوں کہ ضلع کے حکام اور ڈاکٹر ضرور مقتول کو طحال کا مریض سمجھیں گے اور اس کی مدت مرگ اتفاقیہ میں شامل ہوا کرے گی اور اگر کوئی گورنر جنرل بھی اس باب میں دخل دے گا تو ہائی کورٹ کی ناخوشی ہو گی اور اس گورنر جنرل کی کارروائی خلاف ضابطہ قرار پاوے گی۔ جس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو گا کہ بہرکیف تمام امور خلاف ضابطہ ہیں۔ صرف مقتول کا مر جانا ایک باضابطہ کارروائی ہے۔ پس ایسے موقع پر ہماری دانست میں اگر اس بناء پر کارروائی ہوا کرے تو نہایت آسانی ہے کہ ایسے مقتول کی نسبت صرف موتِ تقدیری کا حکم دیا جایا کرے اور یہ لکھا جاوے کہ گو اس کو صاحب نے مارا مگر جب تک کہ اس کی تقدیر میں موت نہ تھی وہ کیوں مر گیا۔ نظر بریں اس کی موت کا سبب صرف اثر تقدیر ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس صورت میں نہایت بھاری الزامِ قانونی سے چنداں سروکار نہ رہے گا۔

قانونِ تعزیراتِ ہند کے اس حکم سے کہ اشتعال طبع کی حالت میں قتل عمد نہیں رہتا اور اگر

آلہ قتل سے قتل نہ کرے تو قتل عمد نہ ہوتا' یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ بے رحم لوگ نہایت جری ہو گئے تھے اور ہر شخص اپنے دل کے غبار نکالنے اور قتل میں کام یاب ہونے کے واسطے اشتعال طبع کا حیلہ پکڑنے لگا تھا۔ مگر تاہم کچھ اندیشہ تھا اور جب سے کہ شاہ جہاں پور میں ایک گورے کے ہاتھ سے تین ہندوستانی مقتول ہوئے اس وقت سے آلہ قتل کی بھی چنداں پروا نہ رہی اور لکھنؤ میں آج کل ایک چوکیدار کا شکار بندوق سے ہوا ہے اور اگر آئندہ ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جیوریوں کی نیت بخیر رہی تو پھر مقتول کے مریض ہونے اور قاتل کے نشہ باز ہونے سے بڑی گنجائش ہو گی اور ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔

اگر ان چھ وارداتوں کے ساتھ شاہ جہان پور کے تین خون اور فلر صاحب کے سائیس کا خون بھی شامل کر لیا جائے تو یہ دس خون ہوتے ہیں جو بہت تھوڑے عرصہ میں واقع ہو چکے ہیں۔ پس اگر گورنمنٹ انگریزی اپنی توجہ اس طرف مائل نہ کرے گی تو اس کے نوجوان ولایت زاد حاکم جو ابھی ہندوستان میں آئے ہیں ہندوستانیوں کے قتل میں ایسے ہی بے باک ہو جاویں گے جیسے اب وہ شکار پر بے باک ہیں اور اس وجہ سے ہندوستانی رعایا کے دل میں ان کی طرف سے ایک ہولناک اندیشہ پیدا ہو جاوے گا اور اس کا نتیجہ تدبیر مملکت کے بالکل برخلاف ہو گا۔

اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ

15 ستمبر 1876ء

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

بعض اخبار ناقل ہیں کہ پونا کی میونسپل کمیٹی پر ایک صاحب یوریپن نے چالیس ہزار روپیہ کا دعویٰ اس ہرجہ کی بابت کیا جو ان کی ایک ٹانگ کے ٹوٹ جانے سے ہوا جس کی کیفیت یہ ہے کہ پونا کی حدود میونسپلٹی کے اندر ایک سڑک کے کنارے اینٹوں کی سرخی کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ صاحب بہادر جو بگھی دوڑاتے ہوئے اس طرف سے نکلے تو بگھی کا پہیہ اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا جس کے صدمہ سے بگھی الٹ گئی اور صاحب گر گئے اور ان کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا۔ صاحب موصوف نے اس الزام میں میونسپل کمیٹی پر نالش کر کے سولہ ہزار روپیہ کی ڈگری حاصل کی۔ پس یہ ایک عجیب و غریب مقدمہ ہے جس کو سن کر ہم کو تعجب ہوتا ہے اور اس قاعدے کے بموجب بہت سی مشکلیں پیش آتی معلوم ہوتی ہیں' کیوں کہ اگر اسی طرح بگھی صاحب ممدوح کی بگھی راہ میں کسی شخص کے مکان کی دیوار سے ٹکر کھاتی تو صاحب ممدوح صاحب مکان پر ٹانگ ٹوٹنے کا دعویٰ کر کے سولہ ہزار کی ڈگری حاصل کرتے' اور اگر آئندہ راہ میں ان کی بگھی کی جھپٹ میں کوئی آدمی آجاوے گا اور صاحب کا گھوڑا اس کے سبب سے چونک جاوے گا اور صاحب گر کر ہاتھ پاؤں توڑ لیں گے تو اس غریب پر نالش کر کے ہرجہ وصول کریں گے اور وہ غریب بجھپٹ میں مر گیا تو صاحب اس کے ورثاء پر ہرجہ کی نالش فرماویں گے۔

ہم کو حیرانی ہے کہ میونسپل کمیٹی پر یہ دعویٰ کیوں کیا گیا اور صاحب جج نے یہ دعویٰ کیوں سن لیا کیوں کہ دراصل صاحب ممدوح اگر ناش کر سکتے تھے تو اپنی آنکھوں پر کر سکتے تھے جن کو یہ نہ سوجھا کہ ہم اندھا دھند بگھی کو کہاں لیے جاتے ہیں' اور اینٹوں کے ڈھیر پر کیوں چڑھاتے ہیں' اور سڑک چھوڑ کر اس کنارے پر کیوں بگھی بھگاتے ہیں' اور اگر ان کی آنکھیں یہ عذر کریں کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم تو صاحب بہادر کی عقل کے ماتحت ہیں۔ جو کچھ مواخذہ ہونا چاہیے صاحب بہادر کی عقل سے ہونا چاہیے' تو یہ عذر بھی قابل سماعت ہو گا اور اس کے سبب سے صاحب بہادر کی عقل بھی مدعا علیہ قرار پاوے گی۔ لیکن اس عذر سے صاحب کی آنکھوں کی بالکل برات نہیں ہو سکتی کیوں کہ جرم قتل یا ضرر رسانی میں کسی نوکر کا یہ عذر کہ مجھ کو میرے آقا نے فلاں

شخص کی نسبت حکم قتل دیا تھا اس لیے میں نے اس کو مار دیا' نوکر کو جرم قتل سے بری نہیں کرتا۔ مگر ہاں البتہ بعد ثبوت کے آقا بھی ماخوذ ہو سکتا ہے۔ پس نظر بریں صاحب موصوف کی آنکھیں اور عقل دونوں مدعا علیہ ہو سکتی ہیں۔

ہم کو یہ بات ظاہر کرنی چاہیے کہ کسی موقع پر بہ ضرورت ملبہ کا اکٹھا ہونا کچھ میونسپل کمیٹی کے حق میں جرم نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ جرم سمجھا جاوے تو میونسپل کمیٹی کوئی کام اپنا نہیں کر سکتی۔

اخبار سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ

15 ستمبر1876ء

جوتے کا مقدمہ

جو لوگ وقت کی مصلحت اور زمانہ کی ضرورت سے بے خبر ہیں اور جن کی نظر میں قومی عزت کوئی شے نہیں ہے اور جن کو قومی ذلت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا' شاید وہ اس خبر کو سن کر بھی بے خبر رہے ہوں گے کہ سر اجلاس ایک نوجوان اسسٹنٹ الہ آباد نے ایک ہندوستانی مختار کا جوتا اتروا کر اس کے سر پر رکھوایا اور چند منٹ تک اس کو اسی طرح کھڑا رکھا۔ چوں کہ وہ ایک ہندوستانی تھا اور اس کی عزت و بے عزتی کا اثر تمام قوم پر ہوتا ہے اس وجہ سے دور اندیش لوگوں کو اس خبر کے سننے سے نہایت ہی افسوس ہوا ہوگا۔ وہ زبان دراز لوگ جن کے دماغ میں عقلی جوہر بہت کم رکھا گیا ہے جوتے کے معاملہ کو ایک خفیف بات کہتے تھے اور اس کے متعلق بحث و حجت کو مضحکہ بتاتے تھے' اگر وہ اس خبر کو سن کر بھی اسی غلطی میں پڑے رہیں تو بلاشبہ ان کی بے پروائی نہایت افسوس کے لائق ہوگی۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی قوم کے ایک شخص کے سر پر بر سر عدالت جوتا رکھوایا جانا ان کے حق میں کس قدر ذلت کا باعث ہے اور قومی عزت میں نقصان آنا کس نتیجہ کا موجب ہے۔ کیا اب وہ س بات سے خوش ہوں گے کہ ان ہی کی جوتی ان ہی کا سر ہو؟

جس تیز مزاج افسر نے اپنی دانست میں اس حرکت کو اپنی حکومت کی شان سمجھا' ہماری دانست میں وہ اپنی ہم قوم گورنمنٹ کے عدل و انصاف کا حامی نہیں ہے اور شاید وہ اپنی اس تیز مزاجی کے سبب سے گورنمنٹ کے نامور ملازموں میں شمار نہ ہو سکے گا۔ اس افسر نے شاید اپنے نزدیک ہندوستان میں اپنی عدالت کو انتہائی عدالت خیال کیا جس کی داد نہ فریاد ورنہ کوئی ضابطۂ انصاف اس کارروائی کو منصفانہ نہیں کہہ سکتا۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ جب کبھی رعایا میں سے کوئی شخص کسی ایسی حرکت کا مرتکب ہوتا ہے جو قانوناً جرم قرار دی جاتی ہے تو کبھی اس کے لیے اس قسم کی زیادتی بھی محرک ہو جاتی ہے۔ اور اس بات کے خیال کرنے سے کہ جب افسران عدالت ہی انصاف نہیں کرتے تو ہم کو اپنا انصاف آپ کر لینا چاہیے' نہایت آزردہ ہو کر لوگ ایسی کارروائی کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی عدالت جو اسی وجہ سے عدالت العالیہ کہلاتی ہے ہائی کورٹ ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے نزدیک ہندوستانیوں کا جوتا پہن کر آنا جانا کچھ خلاف آداب عدالت نہیں ثابت ہوا بلکہ وہاں علی العموم تمام وکلاء اور اہل مقدمہ اجلاس کے کمروں میں بھی جوتا پہن کر جاتے ہیں اور حکام عدالت ہرگز اس پر تعرض نہیں کرتے۔ پس افسوس ہے کہ یہ نوجوان اسسٹنٹ کیوں اس کو خلاف آداب عدالت سمجھے۔ کیا ان کی عدالت کا آداب عدالت ہائی کورٹ کے آداب سے کسی وجہ سے کچھ زیادہ ہے۔ یا ان کی عدالت کے واسطے کوئی خاص عزت ہائی کورٹ کی عزت سے اعلیٰ ہے جس کے سبب سے وہ ایسی زیادتی پر آمادہ ہوئے۔

ہائی کورٹ کی وہ تمام کارروائیاں جن کو وہ خود کرتی ہے یا جن کو جائز رکھتی ہے اور عدالتوں کے واسطے قانون سمجھی جاتی ہیں، پس ہم کو حیرت ہے کہ جس عدالت کی کارروائیاں انفصال خصومات میں قانون سمجھی جاتی ہیں اس عدالت کی کارروائی آداب عدالت کے باب میں کیوں نہیں واجب الاتباع سمجھی جاتی۔

جوتا پہن کر عدالت کے کسی کمرہ میں جانا خلاف آداب ہی قرار پاوے تو جوتا پہن کر جانے والا صرف اس سزا کا مستوجب ہو گا جو قانون کے منشاء کے موافق اس شخص کے واسطے مقرر ہے جو عدالت کی عزت میں خلل انداز ہو اور ہم کو یقین ہے کہ ایسے مجرم کے واسطے کسی قانون میں یہ سزا نہیں ہے کہ مجرم کے سر پر پندرہ منٹ تک جوتیاں رکھوائی جائیں یا جو شخص ذرا بھی اپنے مطلب کی تائید کے واسطے زیادہ گفتگو کرے تو نازک دماغ حاکم اس کے کان پکڑوائے اور اٹھوائے بٹھوائے یا اس کو ڈیم سور کہہ کر سر اجلاس دو لاتیں لگوائے یا راہ چلتے شخص کو اس جرم میں پکڑ کر بید لگوا دے کہ اس نے ہم کو سلام نہیں کیا تھا۔ ایسی سزاؤں کا اپنی طرف سے جاری کرنا جن کے وہ قانوناً" مجاز نہیں ہیں انگریزی عدالتوں کی تہذیب اور انصاف میں سراسر بٹہ لگاتا ہے۔

ہم عدالت ہائی کورٹ کے انصاف اور تہذیب کے نہایت مداح ہیں کہ وہ اپنی غریب رعایا کے ساتھ منصفانہ برتاؤ میں اپنے فرض کو ادا کرتی ہے، مگر اس قدر ہم کو اس کی نسبت بھی خیال ہے کہ اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنی عدالت کو انصاف کا ذمہ دار سمجھ لے اور جو عدالتیں اس کی ماتحت ہیں ان کی پروا نہ کرے۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ خود عدالت العالیہ اور تمام عدالتوں کے انصاف کا مرجع ہے یہ بھی اس کا فرض ہے

اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ

17 مارچ 1876ء

کلکتہ میں ایک صاحب کا بھنگی سے مقدمہ

ایک بھنگی کسی صاحب کے ہاں کلکتہ میں نوکر تھا۔ صاحب سے اور اس بھنگی سے تکرار ہوئی تو صاحب نے اس پر نالش کی مگر مقدمہ خارج ہو گیا۔ ہم کو افسوس ہے کہ صاحب نے ایسے خفیف مقدمہ میں کیوں نالش کی اور کیوں بھنگی کے برابر کھڑے ہو کر مدعی ہوئے۔ خصوصاً" ایسی حالت میں جب کہ وہ خوب جانتے تھے کہ جو بیان انہوں نے عدالت میں کیا وہ چنداں لائق لحاظ نہ تھا۔ کیا ع اس بات کا یقین کر سکتی ہے کہ صاحب بہادر نے بھنگی کو صرف برتن دھونے کا حکم دیا ہو اور بھنگی نے بجواب اس کے حملہ کیا ہو۔ ایک "ذلی ملازم بلاوجہ یہ جرات کر سکتا ہے کہ اپنے آقا کا وہی کام نہ کرے جس کا وہ نوکر ہو اور کام کے مقابلہ میں حملہ کرے۔ کیا کسی کو یہ یقین آسکتا ہے کہ صاحب ایسے حلیم الطبع ہوں کہ بھنگی کی گستاخی پر کچھ ہاتھ پیر نہ ہلاویں۔ بلاشبہ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب صاحب نے نہایت خفیف قصور پر بھنگی کو زیادہ سخت پکڑا ہو گا اور مار پیٹ کی ہو گی تو بھنگی نے لاچار ہو کر اور مسٹر فلر صاحب کے سائیس کو یاد کر کے یہ خیال ہو گا" کہ اگر میں بیٹھا رہا تو مفت جان جاوے گی' اس لیے اس نے اپنی جان بچانے کے واسطے گستاخی کی ہو گی۔ ہمارے قول کی تصدیق سعدی کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

وقت ضرورت چو نماند گریز
دست بگیرد سر شمشیر تیز

اب ہم ذیل میں اس خبر کو لکھتے ہیں:

"مسٹر بروز صاحب ساکن کرو کوڈلین کلکتہ نے اپنے بھنگی پر حملہ آوری کی نالش کی جو 25 ماہ گذشتہ کو واقع ہوا۔ صاحب موصوف نے بھنگی کو ایک قلعی کا برتن صاف کرنے کا حکم دیا تھا لیکن اس نے صاحب کی مرضی کے موافق برتن کو صاف نہیں کیا۔ صاحب نے کہا پھر صاف کرو جس پر مدعا علیہ گستاخی سے پیش آیا اور جب صاحب بہادر نے کھڑے ہو کر اس سے کہا کہ تو مکان سے نکل جا تو مہتر نے لوٹا کھینچ مارا جس سے صاحب کی ٹھوڑی پر گہرا زخم آیا۔ مدعی کا اظہار

تو یہ تھا لیکن اور گواہی سے ثابت ہوا کہ طرفین سے حملہ کی نوبت پہنچی تھی۔ اس وجہ سے صاحب مجسٹریٹ نے مقدمہ خارج کیا۔

اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ

15 ستمبر 1876ء

بچہ کُشی کی عجیب واردات

ہم اپنے گذشتہ پرچہ میں لکھ چکے ہیں کہ ایک پارسی عورت نے، جو دو برس سے بیوہ تھی، ایک حرام کا بچہ جن کر عجیب جرات سے اس کو قتل کرایا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ عورت مذکورہ نے بچہ جن کر ایک اور عورت کی صلاح سے اپنے باورچی سے کہا کہ تو اس بچہ کو ذبح کر ڈال۔ باورچی نے اس بچہ کو نہایت بے رحمی سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور علانیہ یہ جرم کیا گیا۔

یہ بھی ہم کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بچہ کسی یورپین صاحب سے پیدا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہم خیال کرتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہتا تو اس کا نام شائستگی کا نتیجہ رکھا جاتا جو نہایت موزوں نام ہوتا، مگر افسوس ہے کہ اس نالائق ہندوستانی باورچی نے نتیجہ شائستگی کی قدر نہ کر کے اس کو ضائع کر دیا۔ اس بچہ کا اس بے رحمی سے مقتول ہونا صرف اسی وجہ سے افسوس کا باعث نہیں ہے کہ ایک نفس انسانی ضائع ہوا بلکہ اس کے سبب سے یہ بھی افسوس ہے کہ ایک یورپین صاحب کا بچہ ضائع ہو گیا اور اگر وہ زندہ رہتا تو کیسا لائق اور عالی دماغ ہوتا۔

اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ

مئی 1876ء

جناب مولانا مولوی شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ العزیز

اعلم العلما، افضل الفضلا، اکمل الکملا، اعرف العرفا، شرف الافاضل فخر الاماجد، والامثل، رشک سلف، داغ خلف، افضل المحدثین، اشرف علمائے ربانیین، مولانا و بالفضل اولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز ذات فیض سمات ان حضرت بابرکت کی جامع فنون کسبی و وہبی اور مجموعۂ فیوض ظاہری و باطنی تھی۔ اگرچہ جمیع علوم مثل منطق و حکمت و ہندسہ و ہیئت کو خادم علوم دینی کا کر کر تمام ہمت و سراسر سعی کو تحقیقِ غوامض حدیث نبوی و تفسیر کلام الٰہی اور اعلائے اعلام شریعت مقدسہ حضرت رسالت پناہی میں مصروف فرماتے تھے اور سوا اس کے جو کہ جلائے آئینہ باطن صیقل عرفان و ایقان سے کمال کو پہنچی تھی، طالبان صافی نہاد کی ارشاد و تلقین کی طرف توجہ تمام تھی۔ اس پر بھی علوم عقلیہ میں سے کون سا علم تھا کہ اس میں یکتائی اور یک فنی نہ تھی۔ علم ان کے خانوادے میں "بطنا" بعد بطن اور "صلبا" بعد صلب اس طرح سے چلا آتا ہے جیسے سلطنت سلاطین تیموریہ کے خاندان میں چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد اشرف الاماجد، عمدہ علمائے حقیقت آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی خدمت میں تحصیل علوم عقلی و نقلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے تھے۔ اس کے چند مدت کے بعد حضرت شاہ موصوف نے وفات پائی اور آپ کی ذات فائض البرکات سے مسند خلافت نے زینت و بہا اور وسادۂ ارشاد و ہدایت نے رونق بے منتہا حاصل کی، کیونکہ کہ مولانا رفیع الدین اور مولانا عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہا کہیں برادر حقیقی آپ کے، جن کا ذکر بعد اس کے بہ تفصیل آئے گا، والد ماجد کے رو بہ رو سن صغیر رکھتے تھے، تمام علوم اور فیوض کو انہی حضرت کی خدمت میں کسب کیا۔ علم حدیث و تفسیر بعد آپ کے تمام ہندوستان سے مفقود ہو گیا۔ علمائے تمامی ہندوستان کے خوشہ چیں اسی سرگروہ علما کے خرمن کمال کے ہیں اور جمیع کملا اس دیار کے چاشنی گرفتہ اسی زبدۂ اربابِ حقیقت کے مائدۂ فضل و افضال کے۔ یہ آفت جو اس جزو زماں میں تمام دیار ہندوستان "خصوصا" شاہجہان آباد حرسہا اللہ عن الشر والفساد، میں مثل ہوائے وبائی کے عام ہو گئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل آپ کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالے مسائل دینی اور

ترجمۂ قرآن مجید کو اور وہ بھی زبان اردو میں کسی نے استاد سے اور کسی نے اپنے زور طبیعت سے پڑھ لیا ہے، اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرات کر بیٹھا ہے۔ آپ کے ایام حیات تک اس کا اثر نہ تھا بلکہ علمائے تبحر اور فضلائے مقنی المرام باوجود نظر غائر اور احاطہ جزئیات مسائل کے جب تک اپنا سمجھا ہوا حضرت کی خدمت میں عرض نہ کر لیتے تھے، اس کے اظہار میں لب کو وا نہ کرتے تھے اور اس کے بیان میں زبان کو جنبش نہ دیتے تھے۔ حافظہ آپ کا نسخۂ لوحِ تقدیر تھا۔ بارہا اتفاق ہوا کہ کتب غیر مشہورہ کی اکثر عبارات طویل اپنی یاد کے اعتماد پر طلبا کو لکھوا دیں اور جب اتفاقاً" وہ کتابیں دست یاب ہوئیں تو دیکھا گیا کہ جو عبارت آپ نے لکھا دی تھی اس میں من اور عن کا فرق نہ تھا۔ باوجود اس کے کہ سنین عمر شریف قریب اسی کے پہنچ گئے تھے اور کثرت امراض جسمانی سے طاقت بدن مبارک میں کچھ باقی نہ رہی تھی۔ خصوصاً" قلت غذا سے، لیکن برکات فیض باطنی اور حدت قوائے روحانی سے جب تفصیل مسائل دینی اور تمیین دقائق یقینی پر مستعد ہوتے تو ایک دریائے ذخار موج زن ہوتا تھا اور فرط افادات سے حضار کو حالت استغراق بہم پہنچتی تھی۔ اوائل حال میں فرقہ اثنا عشریہ نے شورش کو بلند کیا اور باعث تفرقہ خاطر جہال اہل تسنن کے ہوئے۔ حضرت نے بہ سبب التماس طالبین کمال کے کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کہ غایت شہرت سے محتاج بیان نہیں، بہ دل وبہ توجہ قلیل وجہ صرف اوقات وجیز سے بہ ایں کثرت ضخامت تصنیف کی کہ ہر طالب علم بے مایہ بھی علمائے شیعہ کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ میں کافی ہو گیا۔ ثقات بیان کرتے ہیں کہ آپ تصنیف کے وقت عبارت اس کتاب کی اس طرح سے زبانی ارشاد کرتے جاتے تھے کہ گویا از برباد ہے اور حوالے کتب شیعہ کے جن کو علمائے فرقہ مذکور نے شاید بہ جز نام کے سنا نہ ہو گا، بہ اعتماد حافظہ بیان ہوتے جاتے تھے اور اس پر متانت عبارت اور لطائف و ظرائف جیسے ہیں، ناظرین پر ہویدا ہے۔ یہ امور جو آپ سے ظہور میں آتے تھے، مجال بشری سے باہر ہیں۔ ہفتے میں دوبار مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی اور شائقین صادق العقیدت و صافی نہاد خواص و عوام سے مور و ملخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے اور طریقہ رشد و ہدایت کا استفادہ کرتے۔ 1248 ہجری میں اس جہان فانی سے سفر آخرت کو اختیار کیا۔ بعض موزوں طبیعتوں نے دو تین قطعے تاریخ وفات میں موزوں کیے ہیں۔ ان میں سے ایک قطعہ لکھتا ہوں۔ قطعہ:

حجت اللہ ناطق و گویا
شاہ عبدالعزیز فخر زمن
روز شنبہ و ہفتمِ شوال

در میان بہشت ساخت وطن
مہرِ نصف النہار در عرفاں
مثلِ بدر منیر در ہمہ فن
از سر لطف و حلم تاریخش
"رضی اللہ عنہ" گفت حسن

زبان عربی میں نظم و نثر نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ریختہ کلک عدن سلک ان حضرت سے بہت یادگار ہیں۔ اگرچہ وہ نثر عربی جس کو آپ نے دل لگا کے لکھا ہو' راقم کو دستیاب نہیں ہوئی مگر دو چار رقعے جو آپ نے قلم برداشتہ نہایت سرسری طور پر لکھ دیے تھے' ہاتھ لگے' ان میں سے ایک رقعہ تیمناً" لکھ دیتا ہوں

رقعہ عربی

سلام علیکم قد قرات کتابکم
بُقّرة عینی فاق فصل خطابکم
اردت صلات النظم لکن نفیسه
وانفس ماعندی دعاء لیابکم
فقلت بقلب خاشع متضرع
یضاعف ربنا فی لبکم و لبابکم*

(صرف ابتدائی شعر)

آثار الصنادید

جناب مولانا مخدومنا فضل حق سلمہ اللہ تعالیٰ

مستجمع کمالات صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی، بنائے بنائے فضل و افضال بہار آرائے، چمنستان کمال، متکی ارایک اصابت رائے، مسند نشین دیوان افکار رسائی، صاحب خلق محمدیؐ مورد سعادات ازلی و ابدی، حاکم محاکم مناظرات، فرماں روائے کشور محاکمات، عکس آئینہ صافی ضمیری، ثالث اثنین بدیعی و حریری المعی دقت و لوزعی آدان، فرزدق عہد و لبید دوراں، مبطل باطل و محق مولانا محمد فضل حق۔ یہ حضرت خلف الرشید ہیں، جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر اللہ المنعام کے اور تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت سے کی ہے۔ زبان قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کر فخر خان دان لکھا اور فکر دقیق نے جب سرکار کو دریافت کیا فخر جہاں پایا۔ جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہی کے فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بار ہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعویٰ کمال کو فراموش کر کر نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ باایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے۔ سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ خوش بیانی اور امرا القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاں عروج معانی۔ الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگیں ان کے غیرت لعل ناب۔ سرو ان کی سطور عبارت کے آگے پابہ گل اور گل ان کی عبارت رنگیں کے سامنے خجل۔ نرگس اگر ان کے سواد سے نگاہ کو ملا دیتی، مصحف گل کے پڑھنے سے عاجز نہ رہتی، اور سوسن اگر ان کی عبارت فصیح سے زبان کو آشنا کرتی، صفت گویائی سے عاری نہ ہوتی۔ دل متردد ہے کہ اگر ان اوصاف نامحصور کا شمار بھی ہو سکا تو ظرف تنگ سخن میں کیوں کر گنجائش ہوگی اور بالفرض اگر حوصلہ سخن، میں بھی سمایا قلم فرسودہ زبان اتنا طی لسان اور کاغذ بے چارہ اس قدر وسعت کہاں سے لاوے، اور علاوہ اس کے اندیشہ اپنی جان پر لرزاں ہے کہ اس سرخیل

سر کردگان روزگار کے اوصاف جمیلہ میں سے مثلاً" بلندی شان کے مدح کے درپے ہو تو بالضرور تلاش معنی بلند میں منتہائے عالم بالا کی طرف صعود کرنا چاہیے۔ اگر خدا ناخواستہ ایسے مقام سے پاؤں رپٹا تو گو کہ جس جگہ گرے گا وہ بھی معنی بلند ہی ہو گا' لیکن از بس کہ اس سے اس تک ہزار سالہ راہ بالا ہے۔ اس بے چارے کے پاؤ سر کی خیریت کا ٹھکانا نہیں لگتا۔ ناگزیر عنان تفکر کو اس وادی بے منتہا سے پھیر کر کچھ حال سعادت اشتمال لکھتا ہوں۔

ولود میمنت آمود آپ کا 1211 ہجری میں ہوا ہے۔ سبحان اللہ وہ کیا زمانہ سعید اور وقت حمید تھا۔ ایسے طالع پر عطارد کو غیرت ہے اور اس کی سعادت پر مشتری کو حسرت۔ اب سن شریف آپ کا باون تک پہنچا۔ گو طبیعت کو ویسی ہی رسائی اور ذہن کو ویسی ترقی ہے۔ اس ترقیات روز افزوں کے ساتھ آرزو ہے کہ ایسے صاحبِ کمال کے خزانہ عمر میں بھی ترقی روز یہ عطا ہو۔ آمین رب العالمین۔

آثار الصنادید

جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب مدظلہ العالی

ہمائے اوجِ مفاخر و معالی، جاگزین سدرۃ المنتہیٰ، مراتب بلند و مدارج عالی، موسس اساس شیوا بیانی، بانی بنائے الفاظ و معانی، عندلیبِ بہارستانِ سخن گستری، طوطیٔ شکرستانِ معنی پروری، اوج سمائے برتری ووالاتباری، مہرِ سپہر بلند اختری و گردوں اقتداری، شاگرد رحمٰن، استاد سحبان المعی زمان، لوذعی بیان، فرزدق دہر و لبید آوان، سمی وصی رسولؐ اللہ جناب مستطاب مرزا اسد اللہ غالب تخلص، دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانے میں خاموش، چراغِ انوری انہی کے شعلۂ فکر سے روشن اور سینہ آذری انہی کی آتش حسرت سے گلخن عنصری، ان کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے متکون ہوا تھا اور سحبان ان کی حسرتِ کمال سے ایسا رویا کہ مگر اس کی بینائی چشم فقط عنصرِ آب سے بنی تھی۔ زلالی ان کے چشمہ ہنر کا تشنہ لب اور ابو اسحاق اطمعہ ان کے خوانِ استعداد سے نعمت طلب، خاقانی اس خسروِ معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اس بادشاہِ سخن کے آگے سرگرمِ خدمت۔ ملاحتِ کلامِ سعدی ان کے خوانِ فیض کی نمک خوار اور شیرینیٔ زبانِ حافظ ان کی نعمتِ مقال سے روزینہ دار۔ رنگینیٔ معنی سے صفحے کو گل رنگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خاصہ اسی چمن طراز سخن وری اور نقاش صحیفہ ہنر پروری کا ہے۔ اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورق بیاض صدمہ صرصر سے جگہ سے نہ ہلے۔ قلم ان کا معنی روشن کی تراوش سے فوارۂ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطفِ کیفیت سے شرابِ انگور۔ اگر اس سخن طراز کے کمال استعداد کو جو ظرف حصر و شمار سے افزوں ہے، خامہ دو زبان بیان کرے، اول چاہیے کہ ملکہ عقل فعال سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہرگاہ میں نے اس تقدس جوہر اور امداد مبداء فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا، کارکنان بارگاہ جلال

سے کمی استعداد کا طعنہ سنا اور سوء ادب کی سرزنش حاصل کی۔ تو یہ ایں ہمہ نقصان عقل و ہوش کس شمار میں ہے۔ فی الحقیقت اگر لنگ لنگان اپنے تئیں جاوہ مقصود میں ڈال دیا تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی اور حال یہ ہے کہ دشوار پسند ان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابان انصاف طینت کے آگے حصول صلہ آفریں تو کیا خجلت نارسائی اور طعنہ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ ظہوری نے سچ کہا ہے "کسے کہ عہدے ثنائے کسے بیرون نیاید' چرا اول بہ عجز اعتراف نماید' بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشہ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے۔

بیت

بامی است بصد بلند و پستی
ہاں پاے نہ لغزوت زمستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خان تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بہ سبب اس کے' کہ ان کے ہم جنس و ہم گھر تھے' فرماں روائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دورہ تمام ہوا' ان کے آباو اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جد امجد اپنے پدرِ مشفق سے ایک امرِ سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے اور اس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشوونما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باش اکبر آباد اختیار کی اور حضرت ممدوح کو والدہ مشفقہ کے کنار شفقت اور آغوش عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جنات نعیم کے گل گشت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے چچا حقیقی نصراللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے' آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے۔ جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریز کا ہوا' نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے اعادی بادپیما کے ساتھ سرگرم جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب نے اس کار نمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافات اکبر آباد سے ان کے حین حیات تک جاگیر میں عطا کیے۔ پھر ان کے سانحہ ناگزیر کے بعد جو 1806ء میں پیش آیا'

جاگیر موافق قرار داد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں اس حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی۔ پھر وہاں سے بہ سبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہجہان آباد میں تشریف لائے اور اس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالمِ تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جانِ سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرہ الفاظ دہن شکر اور ہر حرف زبان سپاس ہے۔ ان کی نعمت تربیت کا راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے، اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطہ تحریر میں آسکتا ہے۔ اور چوں کہ "دلہا را بدلہا راہ باشد" ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہو گا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جواہر گراں مایہ، کہ آپ سے حاصل کرتے ہیں، اس کو مغتنم جان کر یہی جزو ان حافظہ میں محفوظ اور یہی صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین عطائی ہر مستفید کے پاس خروار خروار فراہم آگئے ہیں اور چونکہ مثل مبداء فیاض کے آپ کی طبیعت فیض موہبت نسبت بخل سے مبرا ہے، آپ کو ان جواہر بے بہا کے اعطا میں کچھ دریغ نہیں۔ آرے:

نطقش کہ بدوست جاں توانا
چوں بادہ، خرو فزاے دانا

آپ کا جواہر خانہ نفائس سخن حد شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے بیروں ہے۔ ایک دیوان قصائد و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے۔ اور اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب "پنج آہنگ" نام نہایت فوائد جلیلہ پر مشتمل، قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائج فکر سے ہے کہ تشنگان معنی رس کے واسطے مغتنمات عظمیٰ سے ہے۔ اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دست گاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی اگر ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی، گلدستہ بزم احباب ہو گی۔

اشعار ریختہ

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے، پر کس وقت

شب کو کسو کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہے
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پاجائے ہے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ بس
زلف گر بن جاؤں تو شانوں میں الجھا دے مجھے

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

افسوس ہے کہ جناب ممدوح نے 15 / اپریل 1880ء کو ضیق النفس کی بیماری سے بمقام دیو بند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم اور فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اسی دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کے مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت کم لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسمؒ صاحب کو نہایت کم عمر میں دہلی میں تعلیم پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کی اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے	سرش	زہوش	مندی
می	تافت	ستارہ	بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ صاحب کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی نہایت پابند شریعت اور سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں زائد از حد کوشش

کرتے تھے بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہیں کی کوششوں سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں رکھتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم کے کسی فعل کو خواہ وہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کرسکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو کہ وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اسی کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔ مسئلہ حب للّٰہ اور بغض للّٰہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہے بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل شخص تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاق صاحب سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں، نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو رہیں، یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔

دیو بند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

24 اپریل 1880ء

مسجد جہاں نما یا مسجد جامع

یہ مسجد اقصیٰ اور یہ معبد اعلاازک شاہجہاں آباد سے ہزار گز کے فاصلے پر غرب کی طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے کہ وہ پہاڑی اس میں بالکل چھپ گئی ہے اور شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ نے اس مسجد کو بنایا ہے کہ لطافت اور نزاکت اور خوبی اور خوش نمائی اس کی بیان سے باہر ہے۔ آدمی کی طاقت نہیں کہ اس کا بیان کر سکے۔ ایسی خوش قطع اور خوش نما مسجد روئے زمین پر نہیں۔ سر سے پاؤں تک ایک رنگ کے سنگ سرخ کی ہے، اور اندر سے اجارے تک سنگ مرمر کی اور جابہ جا سنگ سرخ میں سنگ مرمر کی دھاریاں اور سنگ موسیٰ کی پچی کاری کی ہوئی ہے۔ برج اس کے تمام سنگ مرمر کے ہیں اور اس میں سنگ موسیٰ کی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔ ایسے مہندس بے بدل نے یہ مسجد بنائی ہے کہ کوئی در و دیوار، طاق و محراب، مرغولہ و کنگورہ تناسب سے خالی نہیں۔ دسویں شوال 1060 ہجری موافق 1650ء عیسوی مطابق سال بست و چہارم جلوس میں اس مسجد کی بنیاد بہ اہتمام سعد اللہ خاں دیوان اعلا اور فاضل خاں خانساماں کے، پڑنی شروع ہوئی اور ہر روز پانچ ہزار راج، مزدور، بیل دار، سنگ تراش کام کرتے تھے۔ باوجود اس اہتمام کے چھے برس میں دس لاکھ روپیہ خرچ ہو کر یہ مسجد تمام ہوئی۔ اس مسجد کے تین گنبد ہیں۔ نہایت خوش نما۔ نوے گز کے طول اور بیس گز کے عرض میں۔ اندر کو سات محرابیں ہیں اور باہر صحن کی طرف گیارہ در۔ ایک در تو بہت بلند ہے اور پانچ پانچ در ادھر ادھر ہیں۔ بڑے در پر 'تو یا ہادی' بہ طور طغرا اور باقی دروں پر کتبہ نام نامی شاہجہاں اور تاریخ تعمیر اور زرِ مصارف سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے کھدا ہوا ہے۔ ان دروں کے دونوں طرف مینار ہیں۔ نہایت بلند اور بغایت خوش نما، اور اس میں زینے بنے ہوئے ہیں کہ اس رستے سے مینار کے اوپر چلے جاتے ہیں۔ میناروں کے اوپر بارہ دری کی برجیاں سنگ مرمر کی نہایت دل کشا، دل ربا بنی ہوئی ہیں۔ ان میناروں پر چڑھنے سے شہر کی عجب کیفیت معلوم ہوتی ہے اور نہایت سیر دکھائی دیتی ہے۔ تمام شہر مثل کٹورے کے معلوم ہوتا ہے، اور درختوں کی رونق اور مکانوں کی خوش نمائی سے ایک عالم دکھائی دیتا ہے۔ شمالی منارہ بہ سبب بجلی کے گر پڑا تھا اور اس عمارت اور صحن کا

فرش بھی، کہ تمام سنگ سرخ کا ہے، جابہ جا سے بگڑ گیا تھا۔ سرکار انگریزی نے 1233 ہجری مطابق 1817ء عیسوی کے، معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ کے عہد میں اس مینار کو بنوا دیا اور فرش بھی درست کروا دیا، کثرت نمازیوں کی ماشاء اللہ اس مسجد میں مور و ملخ سے زیادہ ہوتی ہے اور امام کی آواز تکبیر سب نمازیوں کو نہیں پہنچ سکتی، اس واسطے شاہزادہ مرزا سلیم ابن معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ نے 1245 ہجری مطابق 1829ء عیسوی کے بڑے در کے بیچ میں ایک مکبرہ سنگ باسی کا بہت خوش نما بنوا دیا ہے کہ مکبرہ اس مکبر پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر اور ربنا لک الحمد سب کے کان کا آویزہ کرتا ہے۔ اس مسجد میں تمام فرش سنگ مرمر کا ہے اور اس میں سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے مصلے بنا دیے ہیں۔ منبر اس مسجد کا سنگ مرمر کا ہے اور ایسا خوش قطع بنا ہوا ہے کہ جس کا بیان ممکن نہیں۔ جانب شمال کے، دالان میں کچھ تبرکات جناب خاتم الانبیا علیہ الصلوۃ والسلام کے رکھے ہیں اور وہ مقام درگاہ آثار شریف کہلاتا ہے۔ صحن مسجد کا نہایت دل کشا اور بہ غایت فرحت بخش ہے۔ ایک سو چھتیس گز کا عرض و طول ہے اور اس کے بیچوں بیچ میں حوض ہے، فرحت بخش، روح افزا، دل کش اور دل ربا، پندرہ گز سے بارہ گز کا نرا سنگ مرمر کا اور اسکے بیچ میں فوارہ لگا ہوا ہے اور جمعہ اور عیدین اور الوداع کو چھوٹا کرتا ہے۔ اس حوض کے غربی گوشے پر محمد تحسین خاں محلی بادشاہی نے 1180 ہجری مطابق 1766ء عیسوی میں، یہ بات بیان کر کر کہ میں نے جناب رسول خدا ﷺ کو خواب میں اس جگہ بیٹھے دیکھا ہے، ایک چھوٹا سا کٹہرا پتھر کا لگوا دیا ہے۔ اس مسجد کے صحن کے چاروں طرف ایوان ہائے خوش نما اور دالان ہائے فرحت افزا اور حجرہ ہائے دل کش اور مکانات فرحت بخش بنے ہوئے ہیں اور چاروں کونوں پر چار برج ہیں، بارہ دری کے بہت دل چسپ کہ اس سے ایک عجب رونق اور بہار حاصل ہو گئی ہے۔ جنوبی اور شرقی دالان کے سامنے دائرہ ہندی وقت نماز جاننے کو بنا ہوا ہے۔ اس مسجد کے تین دروازے بہت عالی ہیں۔ تینوں دروازوں میں برنجی کواڑ چڑھے ہوئے ہیں۔

دروازۂ جنوبی مسجدِ جامع

جنوبی دروازہ اس مسجد جامع کا چتلی قبر کے بازار کی طرف بہت خوش نما بنا ہوا ہے۔ دروازے پر رہنے کے لائق حجرے بنے ہوئے ہیں۔ اس دروازے کی تینتیس سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں پر تیسرے پہر کو مجمع عام رہتا ہے اور بساطی اپنی اپنی دوکانیں لگاتے ہیں اور طرح بہ طرح کی چیزیں بیچتے ہیں، اور فالودے والا اپنی دوکان لگاتا ہے اور شربت قند اور فالودہ رنگین بیچتا

ہے۔ کبابی ہر ہر طرح کے کباب بناتے ہیں کہ اس کی بو پر عاشق بہ رشتۂ جان حسرت لے جاتے ہیں۔ عجب عجب طرح کے جانور اور اصیل اصیل مرغ بکتے ہیں اور جوانان فرشتہ صورت ایام نوروز میں انڈے لڑاتے ہیں کہ آسمان بھی ان کی جفا کاری اور نیرنگی پر رشک کھاتا ہے۔ یاران ہم عمر اور جوانان ہم سیرت ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے سیر و تماشا کرتے پھرتے ہیں۔

دروازۂ شمالی مسجدِ جامع

دروازہ شمالی اس مسجد کا پائے والوں کے بازار کی طرف واقع ہے۔ یہ دروازہ بھی بہت خوب صورت ہے اور اس پر بھی حجرے رہنے کے لائق بنے ہوئے ہیں اور اس طرف انتالیس سیڑھیاں ہیں۔ اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھتے ہیں اور سودے والے دوکانیں لگاتے ہیں، لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے۔ تیسرے پہر ایک قصہ خواں مونڈھا بچھائے ہوئے بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ کہتا ہے۔ کسی طرف قصہ حاتم طائی اور کہیں داستان بوستان خیال ہوتی ہے اور صدہا آدمی اس کے سننے کو جمع ہوتے ہیں۔ ایک طرف مداری تماشا کرتا ہے اور بھان متی کا کھیل ہوتا ہے اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے۔

دروازہ شرقی مسجد جامع

شرقی دروازہ اس مسجد عالی کا خاص بازار کی طرف ہے۔ یہ بہت بڑا دروازہ ہے۔ اس پر مکانات بھی بہت بنے ہوئے ہیں۔ اس دروازے کے آگے پینتیس سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں پر ہر روز گزری ہوتی ہے۔ یہ گزری بھی شاہجہاں آباد میں گویا ہر روز کا میلا ہے۔ ہزار طرح طرح کے کپڑے الگنیوں پر ڈالتے ہیں اور عجب عجب خوش نمائی سے در و دیوار پر باغ سا کھلا معلوم ہوتا ہے۔ جوانان عشق سرشت طرح طرح کے جانور پنجروں میں لیے ہوئے سیر کرتے پھرتے ہیں اور ان کی اچھی اچھی آوازیں سناتے ہیں۔ ایک طرف کبوتر والے کبوتر بیچتے ہیں اور ایک طرف گھوڑے والے گھوڑے لیے کھڑے ہیں۔ خریدار جوق در جوق پڑے پھرتے ہیں اور ایک ایک چیز نقد دل کے بدلے مول لیتے ہیں۔

دار الشفا اور دار البقا

اس مسجد کے گرد بہت چوڑا بازار چھوڑ کر شرقی دونوں کونوں کی طرف دو حوض بڑے بڑے بنائے تھے۔ اب وہ حوض بند ہو گئے ہیں اور ان پر مکانات بن گئے ہیں اور غربی دونوں کونوں میں سے شمال کی طرف دار الشفا تھی اور بادشاہ کی طرف سے حکیم مقرر تھے اور بیماروں کو دوا ملتی تھی۔ اب وہ کارخانہ نہیں رہا۔ بادشاہ زادوں نے اس پر مکان بنا لیے ہیں اور رہتے ہیں اور جنوب کی طرف دار البقا یعنی مدرسہ ہے۔ یہ مدرسہ بھی بالکل ویران ہو گیا تھا اور اکثر مکان گر پڑے تھے۔ مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور شاہجہاں آباد نے اس مدرسے کو بادشاہ سے لے کر آباد کیا ہے اور اکثر مکانات شکستہ کی مرمت کی ہے اور بہت مستعد طالب علم بسائے ہیں۔ یہ دونوں مکان بھی شاہجہانی ہیں اور جامع مسجد کے ساتھ تخمیناً" 1050ء ہجری مطابق 1650 عیسوی میں بننے شروع ہوئے۔

(آثار الصنادید - 1847ء)

اردو زبان کے بیان میں

اگرچہ سرسید نے اردو زبان کے بیان میں جو کچھ لکھا ہے وہ لسانیات اور تاریخ کے اعتبار سے مکمل درست نہیں ہے، مگر لسانی مطالعہ میں ان کی اولیت کی شہادت ضرور ہے۔ پھر کئی مضامین کو انہوں نے اختصار کے ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ پہیلی، مکری نسبتیں اور ریختی کے ذکر میں دلچسپی ہے، اور میر صاحب سے ان کی دلچسپی قابل توجہ ہے۔

مرتب

1- ہندوؤں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے، چالنے، لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ 587 ہجری مطابق 1191ء عیسوی موافق سمت 1248 بکرماجیت کے، جب مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پکڑا تو بادشاہی دفتر فارسی ہو گیا مگر زبان رعایا کی وہی بھاشا رہی۔ 894 ہجری مطابق 1488 عیسوی تک بہ جز بادشاہی دفتر کے، رعایا میں فارسی کا رواج نہیں ہوا۔ اس کے چند روز بعد، سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں میں سے کاستھوں نے، جو ہمیشہ سے اموراتِ ملکی اور تربیت دفتر میں مداخلت رکھتے تھے، فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا، پھر رفتہ رفتہ اور قوموں نے بھی شروع کر لیا اور فارسی لکھنے پڑھنے کا ہندوؤں میں بھی رواج ہو گیا۔

2- اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر و تبدیل نہیں ہوئی تھی، مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے، پر جب بھی امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں کے زمانے سے، یعنی حضرت مسیح سے تیرھویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کیے تھے اور کچھ پہلیاں اور مکریاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہیں تھیں، جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شوع ہوا ہو، مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جاوے۔ جب کہ شاہجہان بادشاہ نے 1058 ہجری مطابق 1648ء عیسوی کے شہر شاہجہاں آباد، آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا مل گئی اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بہ سبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدیل ہو گئی۔ غرض کہ لشکر بادشاہی اور اردوے معلی میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا۔ پھر کثرت استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب

اور آراستگی ہوتی گئی، یہاں تک کہ تخمیناً 1100 ہجری مطابق 1688 عیسوی کے، یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔ اگرچہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اس زبان میں ولی نے شعر کہا مگر خود ولی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کسی نے اس زبان میں شعر کہا ہے، کیونکہ اس کے شعروں میں اور شاعروں کی زبان پر طنز نکلتی ہے۔ مگر اس زمانے کے شعر بہت پھیکے اور نہایت سست بندش کے تھے۔ پھر دن بہ دن اس کو ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ میر اور سودا نے اس کو کمال پر پہنچا دیا۔

3- میر کی زبان ایسی صاف اور شستہ ہے اور اس کے شعروں میں ایسے اچھے محاورات بے تکلف بندھے ہیں کہ آج تک سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سودا کی زبان بھی اگرچہ بہت خوب ہے اور مضامین کی تیزی میر پر غالب ہے، مگر میر کی زبان کو اس کی زبان نہیں پہنچتی۔

4- اردو نثر لکھنے والوں میں میر امن، جس نے "باغ و بہار" لکھا، سب پر فوق لے گیا۔ حقیقت میں نظم لکھنے میں جیسا کمال میر کو ہے، نثر لکھنے میں ویسا ہی کمال میر امن کو ہے۔

5- عربی زبان کا اردو میں ترجمہ سب سے پہلے مولوی عبدالقادر صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب نے کیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب کا اردو ترجمہ کلام اللہ کا اردو لغات کے لیے ایک سند ہے اور مولوی رفیع الدین صاحب کا ترجمہ تراکیب نحوی کے لیے ایک بہت عمدہ دستاویز ہے۔

6- اردو زبان کے شعروں کا بھی طریقہ فارسی شعروں کے قاعدے پر یوں ہی آن پڑا ہے کہ گویا جوان مرد خوب صورت لڑکے کی تعریف میں شعر کہتا ہے۔

7- ہندی بھاشا میں دستور تھا کہ عورت کی زبان سے مرد کی نسبت شوقیہ شعر ہوتے تھے۔ بعضی بعضی دفعہ اردو زبان میں اسی طرح پر بھی شعر کہا جاتا ہے اور اس کو ریختی بولتے ہیں۔ غالب ہے کہ تخمیناً 1220 ہجری مطابق 1805ء عیسوی کے انشاء اللہ خاں نے اس کو رواج دیا۔

8- فارسی شعروں کی جو بحریں اور اقسام ہیں وہ سب اردو شعروں میں مروج ہیں۔ الا مکری اور پہیلی کہنے کا وزن بھی اور ہے، زبان بھی ایسی ہے جس میں اکثر بھاشا ملی ہوئی ہے۔

9- نسبتیں جو مشہور ہیں، فقرے ہوتے ہیں کہ ان میں دو یا تین یا زائد چیزیں جس میں کچھ باعتبار ظاہر کے مناسبت نہیں معلوم ہوتی ہے، بیان کی جاتی ہیں اور مخاطب سے پوچھا جاتا ہے کہ ایسی ایک بات جامع بیان کرے جو سب میں پائی جاوے۔

10- پہیلی میں کسی چیز کے اوصاف اور خصائص اور پتے بیان کیے جاتے ہیں اور مخاطب سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے۔ بڑی خوبی پہیلی کی یہ ہے کہ اس چیز کا نام بھی آجاوے جس کے اوصاف اور خصائص بیان کیے گئے ہیں، پھر اس پر بھی مخاطب نہ سمجھے۔

11- (کہہ) مکری میں عورت کی زبان سے ذو معنی بات بیان کی جاتی ہے کہ جس میں ایک سے معشوق مراد ہوتا ہے اور دوسری سے اور کچھ۔ قائل اس کا جب چاہے معشوق کی بات سے مکر جائے۔

پہیلیاں

بالا تھا تو سب کو بھایا
بڑا ہوا تو کچھ کام نہ آیا
میں لے دیا اس کا ناؤں
بوجھے تو بوجھ نہیں چھوڑ دے گاؤں

دیا۔ یعنی چراغ

فارسی بولی آئی نا
ترکی بولی پائی نا
ہندی کہتی عارسی آوے
منہ دیکھوں جو اسے بتاوے

آئینہ

کہہ مکرنی

آپ ہلے اور مو کو ہلاوے
واکا ہلنا مو کو بھاوے
ہل ہلا کے بھیا نسنکھا
اے سکھی ساجن نا سکھی پنکھا

پنکھا

نسبتیں

گوشت کیوں نہ کھایا
ڈوم کیوں نہ گایا

گلا نہ تھا

انار کھایا کیوں نہیں
وزیر رکھا کیوں نہیں

دانا نہ تھا

سموسہ کیوں نہ کھایا
جوتا کیوں نہ پہنا

تلا نہ تھا۔

ریختی

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم، اچھا
لو میں بھی نہ بولوں گی خدا کی قسم، اچھا

شعر اردو

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دیوانے ہیں

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں میں سب اسیر ہوئے

(آثار الصنادید)

خطبات

تقاریر

خدا کا گھر خدا کے نام سے آباد رہے

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جہاں خون مسلم کی ارزانی نے کوچہ و بازار کو لالہ رنگ بنا دیا وہاں سینکڑوں مساجد کے دروازے مقفل کر دیئے گئے، اور وہاں نماز پڑھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

ایسی ہی مسجدوں میں آگرہ کی جامع مسجد بھی تھی۔ جب اس کی واگزاری کے احکام جاری کئے گئے تو مسجد میں مسلمانوں نے ایک جلسۂ تہنیت منعقد کیا۔ سرسید بھی اس جلسہ میں شریک تھے اور انہوں نے اس موقع پر یہ مختصر تقریر کی

مرتب

اے ہمارے مقدس خدا! تیرا نام ازل سے مقدس ہے۔ اے قدوس مطلق، تیرا نام ابد تک مقدس رہے گا۔ اے ذات پاک، تو اپنے آپ ہی مقدس ہے۔ اگر سارا جہان تیری تقدیس کرے جب بھی تیرے مقدس ہونے میں کچھ زیادتی نہیں اور اگر کوئی بھی تجھ کو مقدس کہہ کر نہ پکارے جب بھی تیرے مقدس ہونے میں کوئی کمی نہیں۔ ہم تیرے عاجز بندے تیرا مقدس نام لینے کو مسجدیں بناتے ہیں، تیرا نام پاک ان میں لیتے ہیں۔ ان کی محرابوں میں کھڑے ہو کر تجھ مقدس کو مقدس کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ عمارتیں کچھ ہمارے گھر نہیں ہیں اور نہ تو کسی گھر کا محتاج ہے، مگر خاص تیرا نام لینے سے وہ عمارتیں تیرا گھر کہلاتی ہیں۔ ہم خود جانتے ہیں کہ وہ اینٹ پتھر جو ان عمارتوں میں لگتا ہے، کچھ مقدس نہیں ہے اور عمارتوں کی خوبصورتی اور عالیشانی کچھ مقدس نہیں ہے بلکہ تیرا نام مقدس ہے۔ تیرے نام سے تیرا گھر مقدس گنا جاتا ہے۔ پھر جیسے کہ تو تمام جہان کا مالک ہے اپنے اس گھر کا بھی مالک ہے، خواہ تو اس کو آباد رکھ، خواہ تو اس کو ویران رکھ، اور تیرا نام ویسا ہی مقدس ہے جیسا کہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

اے خدا! اکبر آباد کی یہ جامع مسجد تیرا مقدس نام لینے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس کے پتھر،

جن سے یہ بنی ہے' کچھ بھی ہونے کے لائق نہ تھے' مگر تیرے مقدس نام نے' جو اس میں لیا جاتا تھا' اس کو مقدس ٹھہرایا تھا۔ ہم تیرے گنہگار بندے' جو سر سے پاؤں تک گناہوں نجاست میں آلودہ ہیں' تیرا مقدس نام لینے کے لائق نہیں ہیں۔ تیرا فضل اور تیرا احسان ہے جو ہماری ناپاک زبان سے اپنا مقدس نام لیواتا ہے۔ یہ بات بہت ظاہر ہے کہ اینٹ اور پتھر' جس سے اس مقدس نام لینے کو تیرا گھر بنایا گیا ہے' کسی گنہ سے گنہ گار ہونے کے لائق نہ تھا۔ ہماری شامت اعمال اور ہمارے دل کی برائیوں کی سرایت نے ہم کو ایسا ناپاک کر دیا تھا کہ خود ہمارے جسم اس لائق نہ رہے تھے کہ تیرے مقدس نام کے گھر میں بھی داخل ہوں۔ اے خدا! تو نے ہمارے گناہوں پر نظر نہیں کی۔ اے خدا تو نے اپنی رحمت ہم گنہ گار بندوں پر کی۔ اے مقدس! تو نے ہمارے ناپاک جسموں کو اپنے رحم سے قبول کیا۔ اے خدا تو نے اپنے فضل سے ہمارے حاکموں کے دل میں ڈالا کہ پھر تیرے اس گھر میں تیرا نام لیں' تیرے نام کی ستائش کریں' تجھ قدوس کو مقدس کہہ کر پکاریں۔ پس ہم تیرے بندے تیرا شکر بجالاتے ہیں اور ان حاکموں کو' جنہوں نے تیرے مقدس نام کا ادب کیا' دل سے دعائے خیر دیتے ہیں۔ اے پاک پروردگار' تو ہمارے اس ناچیز شکر کو اور ہماری اس دعا کو اپنے فضل سے قبول کر' اور جیسے کہ تو مقدس ہے ہمارے بدن اور ہمارے دل اور ہماری جان اور ہماری روح کو اپنے لیے مقدس کر اور گناہوں سے بچا اور اپنی خاص مرضی پر چلا اور اپنے گھر کو اپنے مقدس نام سے آباد رکھ۔ آمین!

دین و دنیا کا رشتہ

سرسید نے 26 مئی' 1873ء کو پٹنہ میں کالج کے فراہمی چندہ کے سلسلہ میں ایک لکچر دیا۔ یہ اسی لکچر کا مختصر اقتباس ہے۔ مرتب

آپ مسلمان رئیس' جو خدا کے فضل سے اس شہر میں موجود ہیں اور جن میں سے بہت سے یہاں تشریف رکھتے ہیں' ان کی لیاقت اور ان کی ثروت سے اسلام کی شوکت کا خیال ہوتا ہے۔ پس اگر تم مسلمان مفلس' ذلیل اور نان شبینہ کو محتاج ہوجاویں گے تو اسلام کی کیا عزت باقی رہے گی۔ وہ نیک عالم اور درویش جو اس قسم کی باتیں کہتے ہیں' وہ خدا کی طرف ایسے متوجہ ہیں کہ ان کو دنیا کی باتوں پر اور عواقب امور پر کچھ خیال نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر مسلمانوں کو دنیاوی علوم اور دنیاوی دولت و حشمت کی عزت حاصل ہوگی تو اس سے خود اسلام کو کیسی رونق و شوکت ہو جاوے گی۔ پس اگر ہم اس نیت سے دنیاوی عزت حاصل کرنے پر کوشش کریں تو میری سمجھ میں گوشہ نشینی اور چلہ کشی سے ہزار درجے بہتر ہے۔ ایک لطیفے پر غور کرو جو اس وقت میرے دل میں آیا ہے۔ کہ

دین اور دنیا کا عجیب رشتہ ہے۔ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا رہتا ہے۔ اب تم دیکھ لو کہ دنیا کے معاملات میں جو ہماری حالت خراب ہو گئی ہے' دین کے معاملات بھی اس کے سبب سے ابتر ہیں۔ ہزاروں مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں' صدہا خانقاہیں ویران ہو گئی ہیں' بڑے بڑے نامی عالموں کے گھرانے برباد ہیں۔ پرانے کتب خانے' پرانے مدرسے نام و نشان کو بھی نہیں رہے۔ عالم فاضل تو اب صرف نام کے رہ گئے ہیں جو پچھلوں کو بھی بدنام کرنے والے ہیں۔ پس جب تک کہ ہم دونوں چیزوں کو یعنی دین و دنیا دونوں کو برابر سنبھالے نہ رہیں گے' ہم کو نہ دین میں کچھ حاصل ہو گا نہ دنیا میں۔

رسم و رواج کی پابندی

یہ اس لکچر کے اقتباسات میں جو سرسید نے 3 نومبر 1873ء کو مرزا پور میں دیا۔ اس کا پھیلاؤ' تاریخی تناظر' رسم و رواج کی تعریف اور گہرائی - ہر چیز قابل توجہ ہے۔ سرسید نے معاشرتی جائزوں اور مطالعوں کو ہماری زندگی' فکر اور زبان کا حصہ بنا دیا۔

مرتب

رسم جس کو انگریزی میں مینرز اور کسٹم کہتے ہیں' اس کا نام ہے جو ہمارے بُرکھوں سے ہوتا چلا آیا ہے' گو کہ ہم کو یہ بھی نہ معلوم رہا ہو کہ وہ کیوں ہوتا تھا اور اس سے کیا فائدہ ہے۔

رواج اس کا نام ہے جس کو سب لوگ کرتے ہوں یا کرنے لگیں اور اس کے کرنے کو لوگ کچھ عیب نہ سمجھیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ ایک زمانے میں کوئی کام عیب گنا جاتا ہو مگر جب وہ رواج پا جاوے تو لوگوں کی آنکھ میں کچھ عیب نہ رہے۔

انگریزی مصنفوں نے کسٹم یعنی رسم کی تعریف زیادہ وضاحت سے بیان کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ ایک کام کا ہمیشہ بار بار کرتے رہنا یا کسی کا پر مدتوں سے بطور قانون کے عمل درآمد چلا آنا رسم کہلاتا ہے۔ رسم ہمیشہ ایک بن لکھا قانون ہوتا ہے جس پر سب لوگ مدت سے اتفاق کرتے چلے آئے ہیں اور اس لیے وہ رسم بطور ایک قانون کے سند ہو جاتی ہے۔

سر والٹر ریلی نے نہایت عمدہ بات کہی ہے کہ رسم اور رواج میں وہ فرق ہے جو سبب اور نتیجے میں ہے' کیوں کہ جب کسی کام کا رواج مدت تک رہتا ہے تو وہ بطور ایک قانون کے لوگوں میں پھیل جاتا ہے اور آخر کو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رسم ہو جاتی ہے۔

عادت میں اور رسم میں ایک نہایت باریک تفاوت ہے۔ عادت خود ہماری طبیعت کا ایک اصول ہے' جو خود ہم میں سے پیدا ہوا ہے اور جو بالطبع اور بے تکلف ہم کو کسی کام کے بار بار کرنے کو کہتا ہے۔ رسم ایک اصول ہے جو باہر سے ہم میں آیا ہے' جس کے سبب سے ہم کسی

کام کو بار با کرتے ہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے مثلاً" دان' پن' خیرات و زکوۃ دینے کی رسم سے فیاضی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

لفظ کسٹم یعنی رسم کا علم قانون میں بھی آتا ہے اور مقنن اس کے یہ معنی بتاتے ہیں کہ " رسم ایک ایسا قانون جو کبھی تحریر میں نہیں آتا ہے' مگر مدتوں سے اور عام لوگوں کی رضا مندی سے جاری ہے..."

امام حجتہ الاسلام غزالیؒ کا نام لیے بغیر میں اس فہرست کو ختم نہیں کر سکتا جس نے اسرار مسائل اسلام کے بیان کرنے میں تابہ مقدور اپنی سعی و کوشش کی۔ اگرچہ بڑے بڑے متعصب مولویوں نے اس کے کفر کے فتوے دیے اور اس کی کتاب "احیاء علوم الدین" کے جلانے کا حکم دیا اور اس کے قتل کے احکام جاری ہوئے' مگر انجام کار وہی غزالی امام اور حجتہ الاسلام کے لقب سے پکارا گیا۔

اس زمانے میں جو واقعات گزرتے ہیں اور جن کو اس کمرے کے اکثر لوگوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہو گا' وہ بھی یہی ہیں کہ جس شخص نے رسومات کی اصلاح و ترقی چاہی' فی الفور اس نے اپنی تمام قوم سے مخالفت کی اور رفتہ رفتہ لوگ اس کے ساتھی ہوتے گئے۔

دیکھو راجہ موہن رائے نے کس طرح اپنی قوم سے مخالفت کر کر ہر قسم کی رسومات میں اصلاح کی اور کتنی کچھ نیکی اپنی قوم میں پھیلائی۔

بابو کیشب چندر سین کا حال سب آپ صاحب جانتے ہیں کہ آفتاب کی مانند' جو مشرق سے طلوع کرے' اس کی ذات سے اس کی قوم میں روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ جڑ اس کی یہی ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی کو توڑا اور اپنی قوم کی مخالفت سے کچھ نہیں ڈرا۔

بنگالے میں ایشر چندر ودیا ساگر کے نام کو اور بمبئی میں وشنو پر سرام شاستری مہاراشٹ برہمن کے نام کو برکت ہو' جنھوں نے ہندو بیوہ عورتوں کی شادی کے رواج میں نہایت کوشش کی اور اپنی ذات اور اپنی قوم کی رسم کو توڑا۔

سریش چندر بھٹا چارجی بھی کچھ کم ادب کے لائق نہیں ہے' جس نے صرف زبانی بات چیت پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ سب سے اول خود ایک بیوہ سے شادی کی اور پرانی رسم کا' جو سانپ کی طرح چمٹ رہی تھی' سر کچلا۔

رام تنولا ہیڑی کا نام بھی نہیں بھولا جا سکتا جس نے اپنی قوم کے مجمع میں سوت کے بٹے ہوئے جنیئو کو توڑ پھینکا اور سچائی کو سچا جنیئو اپنے لئے جانا...

اے میرے دوستو! یہ زمانہ ایسا ہے کہ ہر ایک کے دل میں تہذیب و شائستگی کی امنگ ہے۔

بہت سے لوگوں کو تم دیکھو گے کہ ہزاروں رسموں کو فضول اور لغو سمجھتے ہیں اور کچھ بھی اس میں یقین نہیں رکھتے، پر کرتے ہیں۔ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں، جن کے بے نقص ہونے پر یقین کرتے ہیں، پر کرتے نہیں۔ ایسی باتوں سے کچھ قوم کی بھلائی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ میری سمجھ میں یہ بھی ایک قسم کی دغا بازی ہے۔ میری نصیحت تم سب کو یہ ہے کہ کرو اس کو، جس پر تم کو دلی یقین ہے اور مت کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین نہیں۔ یہی اصلی سچائی ہے اور یہی ایک بات ہے جس پر دونوں جہان کی نیکی منحصر ہے۔ خدا تمہارے نیک کاموں میں تمہاری مدد کرے۔

انتخاب ہمارے مسائل کا حل نہیں

سرسید نے دسمبر 1887ء میں لکھنؤ میں "سیاست اور مسلمان" کے موضوع پر ایک اہم تقریر کی اور انہوں نے صاف صاف کہا کہ جہاں مستقل اکثریت (ہندو) اور مستقل اقلیت (مسلمان) ہو' اس ملک کے لئے انتخابات اور جمہوریت غیر مناسب ہیں۔ تقریر کا اختتامی حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

مرتب

اب آپ خیال کریں کہ کیا حال انتخاب کا ہے۔ کسی ضلع میں ہندو مسلمان برابر نہیں ہوتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان ہندوؤں کو دبا دیں گے اور سلف گورنمنٹ کے مالک ہو جاویں گے۔ ابھی کلکتے میں ایک بڑے بزرگ خاندانی ڈاڑھی والے مسلمان مجھ سے ملے اور کہا کہ "غضب ہو گیا' ہمارے شہر میں اٹھارہ ممبر منتخب ہونے والے تھے' کوئی مسلمان منتخب نہیں ہوا' سب ہندو ہو گئے۔ اب گورنمنٹ سے کسی مسلمان کا مقرر ہونا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ مجھ کو گورنمنٹ منتخب کرلے۔" یہی حال سب شہروں کا ہے۔ علی گڑھ میں بھی اگر خاص قاعدہ مقرر نہ ہو جاتا تو کوئی مسلمان' یہاں تک کہ ہمارے دوست مولوی خواجہ محمد یوسف بھی' جو نہایت معزز ہیں' بہ مشکل اپنے منتخب ہونے کے لیے ووٹ حاصل کر سکتے' اور آخر کو گورنمنٹ کی طرف سے تقرر کے متوقع رہتے۔ پس وہ راہ ہم کیونکر چل سکتے ہیں جس کے نہ ہم قابل ہیں نہ مالک۔

اب مجھ میں طاقت نہیں ہے اور میں تھک گیا ہوں۔ زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اخیر کو بھی مجھے کچھ کہنا ہے کہ میرے دوست یہ نہ کہیں کہ ہم کو یہ نہ بتایا کہ ملک اور قوم کے لیے کیا بھلائی کیا چیز ہے؟ اور کس چیز سے وہ بھلائی کو پہنچ سکتے ہیں؟ میری عمر ستر برس سے متجاوز ہو گئی ہے اور گو میں اپنی زندگی میں اپنی قوم کو اس درجے پر نہ دیکھ سکوں' جس درجے پر دیکھنے کو میرا دل چاہتا ہے' لیکن میرے دوست جو اس مجلس میں موجود ہیں' ضرور اپنی قوم کو عزت اور خوش حالی

اور بلند درجے پر دیکھیں گے، اگر میری بتائی ہوئی بات مانیں گے۔ دوستو! یہ نہ کہنا کہ مجھ کو اس رنگریز کے مانند جس کو صرف اموہ رنگنا آتا تھا، اموہ رنگ بھاتا ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو چیز تم کو اعلیٰ درجے پر پہنچانے والی ہے، وہ صرف ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ درجے کی تعلیم) ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے، ہم ذلیل رہیں گے، اوروں سے پست رہیں گے۔ اور اس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کا ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دل سوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کی ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ۔ میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ ان سے کہہ دوں اور اپنا فرض ادا کروں۔ اور خدا کے سامنے جو قادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے، اپنے ہاتھوں کو دھو دوں۔

یہ پرزور لیکچر سرسید نے رات کے وقت دیا تھا۔ جب وہ تقریر کرتے کرتے تھک گئے اور لیکچر ختم کر کے بیٹھ گئے تو فوراً ہی ایک صاحب مولوی ابراہیم حسین نے، جو لکھنؤ کے نارمل اسکول میں اورینٹل ٹیچر تھے، فارسی زبان میں ایک قطعہ فی البدیہ تصنیف کر کے اور سرسید کو مخاطب کر کے حاضرین کو سنایا۔

قطعہ

اے ناخدائے کشتیٔ اسلامیانِ ہند
لطفِ تو باد شرطہ طوفانیانِ ہند
زیں قندِ پارسی کہ زبان تو ریختہ
شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
از مرداں دریغ دمِ عیسوی مدار
ذاتِ تو ہمچو جاں بہ جسد درمیانِ ہند

تلک الایام

دسمبر1873ء کو سرسید اپنے ساتھیوں کے ساتھ شالیمار باغ لاہور کی سیر کو گئے بارہ دری میں شاہجہاں کے بیٹھنے کے لئے پتھر کی جو نشست گاہ بنی ہوئی ہے اس پر ایک صاحب جوتوں سمیت چڑھ گئے۔ سرسید کے دل پر اس بات کا گہرا اثر مرتب ہوا اور انہوں نے کہا۔

اے دوستو!

کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ اس وقت کہاں کھڑے ہیں؟ یہ وہ مقام ہے جس کے آس پاس بلکہ دور تک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ لیکن اب آپ دیکھیں کہ وہ کس حالت میں ہے؟ آپ کی کچھ سمجھ میں آیا کہ یہ حالت اس کی کیوں ہو گئی؟ اس لیے ہو گئی کہ یہ کام ایک بادشاہ کا ذاتی فعل تھا اور اس نے اس عالی شان باغ کو، ان خوب صورت آبشاروں کو، اس نفیس بارہ دری کو اور اس خوش نما چبوترے کو محض اپنی تفریح طبع اور اپنے ذاتی آرام و آسائش کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بنایا تھا۔ لیکن آپ دیکھیں کہ وہ کس اجاڑ اور ویران حالت میں ہے اور اس میں لوگ بے دردی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور اس شاہی چبوترے پر بے تکلفی سے چڑھتے اترتے ہیں، جو خاص بادشاہ کے لیے بڑے اہتمام سے بنایا گیا تھا۔ اور جب بادشاہ اس تخت پر بیٹھتا تھا تو بڑے بڑے امراء اور وزراء ہاتھ باندھے اس کے سامنے تخت کے نیچے کھڑے ہوتے تھے۔ پس شاہی باغ اور شاہی چبوترے کی اس ذلیل حالت کو دیکھ کر اے عزیزو! تم عبرت پکڑو۔ اگر یہی کام قومی کام ہوتا اور تمام قوم کے عام فائدے کے لیے بنایا گیا ہوتا تو کبھی ایسی ویرانی اور ذلت کی حالت کو نہ پہنچتا۔ بلکہ جتنا زمانہ گزرتا جاتا، اتنی اس کی عزت اور عظمت بڑھتی جاتی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

قدیم کتابوں اور سکّوں کا تحفظ

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس الہ آباد 1890ء میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ پرانی کتابوں، سکّوں اور کتبوں کے تحفظ کے لئے ایک کتب خانہ اور ایک میوزیم قائم کیا جائے۔ اس قرار داد کی تائید میں سرسید نے یہ تقریر کی

مرتب

جناب صدر انجمن! اگر یہ روزلیوشن، جس کی تحریک میرے دوست سید اکبر حسن نے کی ہے، پاس ہو جاوے تو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک بہت عمدہ اضافہ ہو جاوے گا۔ ہندوستان میں بہت کم کتب خانے باضابطہ مرتب ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ خان بہادر مولوی خدا بخش صاحب کے کتب خانے کے سوا، جنہوں نے حال میں پٹنہ میں کتب خانہ قائم کیا ہے، کوئی اور ایسا مرتب کتب خانہ عربی و فارسی کتابوں کا نہیں ہے۔ متفرق عمدہ اور نایاب کتابیں البتہ متفرق طور پر لوگوں کے پاس ہیں جن کا حال لوگوں اور علمی حلقوں کو بہت ہی کم معلوم ہے۔ عمدہ و نایاب کتابوں سے میری مراد طلائی و مذہب عمدہ طلائی کام کی کتابوں سے نہیں ہے بلکہ ان علمی اور تاریخی اہمیت کی کتابوں سے ہے جو بہت کم یاب ہیں اور جن کے میسر آنے سے تاریخ میں یا علم کی شاخوں میں یا علمائے قدیم کے خیالات معلوم ہونے میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔

ہندوستان میں جہاں کتابیں ہیں ان کی کوئی فہرست چھپ کر شائع نہیں ہوئی اور کوئی ذریعہ اس بات کے معلوم ہونے کا نہیں ہے کہ وہ مفید اور کار آمد کتابیں کس جگہ ہندوستان میں ہیں؟ پائی بھی جاتی ہیں یا نہیں؟ پس اگر ایسی کتابوں کے حالات بذریعہ ایک مختصر رپورٹ کے ہمارے کانفرنس کے رسالے میں شائع ہوں گے تو ملک کو نہایت فائدہ پہنچے گا۔

فرامین کے مواہیر اور طغرا کا اگر فوٹو گراف حاصل ہو اور فوٹو ٹائپ میں یا فوٹو لیتھو گراف میں چھاپا جاوے تو نہایت عمدہ چیز قائم رہے گی۔ قدیم حالات کے دریافت کے شائقین نے سکّوں کے جمع کرنے اور ان کے نقش چھاپنے میں بہت کچھ کوشش کی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ فن

تاریخ کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ مگر ان فرامین کے نقوش طغرا و مواہیر کے جو اس پر ثبت ہوتی ہیں، حاصل کرنے میں بالکل غفلت کی گئی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سکہ جات تاریخ کے فن کو مفید ہیں، اسی طرح وہ مہریں بھی نہایت کار آمد ہیں۔ ان سے تاریخ کے بہت سے واقعات کی صحت ممکن ہے اور بہت سے تاریخانہ واقعات معلوم ہونے کی بنیاد صحیح قرار پا سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ کام بہت بڑا ہے اور اس کے انجام دینے میں صرفہ زیادہ ہو گا، مگر جہاں تک ممکن ہو اس پر کوشش کی جاوے۔

اس وقت ہندوستان اور یورپ کی سوسائٹیوں میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال یا رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ہے۔ اس نے بہت کچھ پرانے سکہ جات اور کتبے بہم پہنچائے ہیں اور ان کے حالات کتابوں میں چھاپ کر مشتہر کیے ہیں۔ لیکن جن کو تاریخ کے فن سے شوق ہے وہ جانتے ہیں کہ ہماری ایشیائی تاریخوں میں، خواہ وہ عربی کی ہوں یا فارسی کی، بہت سے حالات اور واقعات صحت طلب ہیں، خصوصاً ایسے واقعات، جن کا زمانۂ وقوع تاریخ میں مختلف بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتبے اور سکہ جات ان مختلف واقعات اور حالات کو صحیح طور پر تحقیق کرنے کے لیے نہایت عمدہ شہادت ہیں۔ پس اگر کوئی صاحب ان مشتبہ یا مختلف واقعات کو کتبوں اور سکوں کے استدلال سے صحیح طور پر بیان کرے تو ایک بے بہا امداد فن تاریخ کو پہنچتی ہے۔ علی الخصوص سکوں کا تاریخی حالات سے مقابلہ کر کے کچھ غلط فہمی تاریخانہ حالات سے رفع ہو سکتی ہے۔ مثلاً ہم ہندوستان کی تاریخوں میں چند سکوں کا ذکر پڑھتے ہیں جیسے دلیوال، ٹنکہ، دام اور ان کے حال سے بہت کم واقفیت ہے۔ اور اس سبب سے تاریخ کے ایک امر عظیم سے جہالت رہتی ہے۔ اگر اس قسم کی تاریخانہ تحقیقات بھی جس قدر کہ ہو سکے ہماری کانفرنس کے رسالے کے ساتھ شائع ہو تو بہت بڑا فائدہ علم تاریخ کو حاصل ہو گا۔

انجمن فرض

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں اور ان کے طالب علم ساتھیوں نے غریب اور ذہین طالب علموں کی مدد کے لئے "ڈیوٹی سوسائٹی" قائم کی۔ یہ ڈیوٹی سوسائٹی علی گڑھ کالج کی تاریخ میں طلبہ کے احساس ذمہ داری اور خدمت کی عظیم مثال ہے۔

طالب علم شروع سے علی گڑھ کالج کی روایات سازی میں شامل رہے اور یہ بھی سرسید کا کارنامہ ہے۔

1890ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس الہ آباد کے موقع پر ڈیوٹی سوسائٹی نے سرمایہ جمع کرنے کے لئے چائے خانہ قائم کیا۔ سرسید نے سوسائٹی اور اس کے ارکان کی خدمات اور جذبہ کے اعتراف میں یہ تقریر کی۔

مرتب

"ڈیوٹی سوسائٹی" کے ممبر ہماری قوم کے معزز اور قابل ادب خاندانوں کے ممبر ہیں۔ آفتاب احمد خاں، مظہر الحق، محمد مصطفیٰ خاں، طفیل احمد، ممتاز حسین اور عنایت اللہ وغیرہ چائے کی دوکان لے کر یہاں آئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ بعض سخت دل لوگ، جن کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں، وہ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے ان طلباء کا مذاق اڑائیں اور اس بات کو بڑے تمسخر کے ساتھ بیان کریں، لیکن کیا ہوا۔ پتھروں کی نسبت بھی تو خدا تعالیٰ فرمایا ہے:

"وان من الحجارة لما يتفجر منه الانهر و ان منهالما

یشقق فیخرج منہ الماء و انا منھالما یھبط من خشیۃ
اللہ وما اللہ بغافل عما تعملون۔"

(ترجمہ : ان پتھروں میں سے بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے دریا رواں ہو جاتے ہیں۔ اور ان ہی میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی بہنے لگتا ہے۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جو خشیۃ اللہ سے ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں)۔

پس جو دل اس قسم کے پتھر کے بھی ہوں گے' وہ دل بھی ضرور ان طلباء کو قوم کے فخر کا باعث سمجھیں گے' ان کی خدمت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ان کے اس فعل کو قومی ترقی کی بہت بڑی علامت سمجھیں گے۔ اور طلباء کے اس ہمدردی کے جذبے سے بڑے متاثر ہوں گے۔ اللہ پاک اپنے فضل سے ان طلباء کی نیک کوششوں میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے اور ان کو زیادہ سے زیادہ اپنے غریب بھائیوں کی امداد اور اعانت کا موقع دے:

یہی ہے عبادت' یہی دین و ایمان
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اہل ہند کی ترقی، تربیت و تعلیم

سرسید نے یہ تقریر 20 ستمبر 1867ء کو بنارس انسٹی ٹیوٹ کے اجلاس میں، باپو فتح سنگھ کے مکان پر کی تھی

مرتب

... مسلمان بھی جو ایک اجنبی قوم گنی جاتی ہے اور جن کو میں نے ابھی ثابت کیا کہ وہ بھی ہندوستان میں مدت سے متوطن ہو جانے کے سبب مثل اور قوموں کے ہندوستان ہی کی ایک مشابہ قوم ہو گئے ہیں، علم و ہنر اور شائستگی میں کچھ کم درجہ نہ رکھتے تھے۔ فصاحت اور بلاغت ان کا روز مرہ تھا، شاعری ان کے ماں کے پیٹ سے ان کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ حریری و یمنی، متنبی کی کتابیں بھی اب تک دنیا میں موجود ہیں۔ پونے تیرہ سو برس تک کی عورتوں کا کلام اب تک ہمارے پاس موجود ہے جس کے ایک ایک فقرے پر ہزاروں، در شاہوار کی لاکھوں لڑیاں نثار ہوتی ہیں۔ انہوں نے یونانیوں سے جتنا لیا اس کو بہت بڑھایا اور پھر کیا کچھ کر دکھایا۔ طب کو کیسی کچھ ترقی دی۔ علم کیمیا کے اصولوں کی ایجاد کا فخر مسلمانوں ہی کو نصیب ہوا، یہاں تک کہ انگریزی زبان میں اب تک بہت سے لفظ عربی زبان کے اس علم کے اصطلاحوں میں مستعمل ہیں۔ علم حیوانات میں ابو عثمان اور علم نباتات میں عبدالرحمٰن برونی کیسے نام آور ہوئے۔ وزن ہوا اور علم مائیات اور جذب مرکزی اور تجاذب اجزا کی انہوں نے راہ نکالی۔ اس بات کا فخر بلاشبہ مسلمانوں ہی کو ہے کہ ان ہی کے بزرگوں میں سے ابو علی الحسن تھا جس نے یونانیوں اور تمام دنیا کے لوگوں کی اس غلطی کو صحیح کیا کہ آنکھ سے شعاع بصر نہیں نکلتی بلکہ تمام چیزوں کی شبیہ آنکھ میں آکر بنتی ہے۔ اسی تحقیقات کا یہ نتیجہ ہے جو تم آج کل فوٹو گراف کی ایسی ایسی عمدہ تصویریں دیکھتے ہو۔ خلیفہ ماموں کے عہد میں جو زمین کے دائرہ عظیمہ کی نمائش سنجار اور کوفے کے میدانوں میں ہوئی، وہ آج تک ہمارے فخر کا باعث ہے۔ مسلمانوں کا عہد کثرت مدارس سے نہایت اعلیٰ درجے کی عزت رکھتا ہے۔ بغداد، کوفہ، نیشاپور، قرطبہ، غرناطہ کے مدرسے تمام دنیا کے

لوگوں کے لیے بہت بڑی یونیورسٹی کے سے مدرسے تھے۔ اسپین یعنی اندلس کے کتب خانہ شاہی میں ایک لاکھ کتاب مجلد طلائی جلد سے آراستہ تھی۔ اور خلفائے بنی امیہ اندلسی کے وقفی کتب خانے میں چھ لاکھ کتب مجلد تھی، جسکی فہرست چوالیس جلد میں تھی۔ اس کے سوا ستر اور کتب خانے وقفی تھے۔ شماسیہ، بغداد، کوہ قافیہ، دمشق، اندلس، سمرقند، مراغہ اب تک ہمارے صدر خانوں کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں سے معزز و ممتاز ہے۔ خلیفہ ہارون رشید عباسی نے شارل مین بادشاہ انگلستان کو ایک گھڑی بطور تحفے کے بھیجی تھی اور جس کا ذکر اپجسن ہارڈ صاحب نے کیا ہے۔ یہ مسلمانوں کی ترقی تربیت کے لیے ایک نہایت عمدہ ثبوت ہے۔ سب سے بڑی عزت جو کسی قوم کو نصیب ہو سکتی تھی وہ مسلمانوں کو نصیب ہوئی کہ تمام فرنگستان انہی کی بدولت علم و ہنر و شائستگی کے زیور سے آراستہ ہوا۔ ڈاکٹر ڈراپر صاحب فرماتے ہیں کہ علم کے سیکھنے میں اہل فرنگ ابو علی الحسن اور ابو موسیٰ اور ابوالوفاء اور علمائے عرب کے زیادہ تر رہین منت ہیں۔ ہماری روشنی جو دارالخلافہ قرطبہ سے اٹھی اور جس نے تمام فرنگستان کو روشن کر دیا، کبھی بجھنے والی نہیں۔ پھر جب کہ ہندوستان کی ان دونوں قوموں کا یہ حال ہے تو اب کیا چیز باقی ہے، جس میں ہماری تربیت و شائستگی کی ترقی دینے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ باتیں جو کچھ مذکور ہوئیں سب سچ ہیں اور حقیقت میں ہندوستان کی دونوں قوموں کے بڑے فخر کی باعث ہیں۔ سچ ہے کہ دونوں قومیں کیسی ہی مٹ کیوں نہ جاویں ان کا یہ آبائی فخر مٹنے والا نہیں۔ مگر اتنی بات ہے کہ بڑوں کے نام پر غرہ کرنا اور آپ کچھ نہ ہونا عقل کی بات نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "دو چیز در دو چیز باور نیاید۔ ذکر توانگری در فقیری و ذکر جوانی در پیری"

آدمی را بچشم حال نگر از خیال پری و دے بگذر

ہمارے بزرگ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، ہم میں تو وہ باتیں نہیں۔ وہ بلاشبہ علوم دقیق کے موجد تھے، ہم تو اس کے سمجھنے کے بھی قابل نہیں۔ پس ہم کو اپنے حال پر رونا چاہیے، نہ بزرگوں کے نام پر مغرور ہونا۔

جب کہ سلسلہ کلام یہاں تک پہنچتا ہے تو خود بخود ہماری طبیعت اس طرف مائل ہوتی ہے کہ ہرگاہ ہمارے بزرگ ایسے تھے اور وہ نہایت عمدہ علوم کے عالم بلکہ موجد تھے، اور اور ہنروں میں بھی باکمال تھے، تو ہماری ترقی تربیت اور کاملیت کے درجے پر پہنچنے کے لیے یہی بات کافی ہوگی کہ ہم انہی علوم و فنون آبائی کے زندہ کرنے پر متوجہ ہوں۔...

پس ہم کو اپنے تئیں ملکی فخر و امتیاز نصیب ہونے کے لیے یہی چاہیے کہ ہم عام علم اور عام تربیت کے پھیلانے پر یک دل ہو کر کوشش کریں، مگر نہ کسی جھوٹے یا اوپرے دل سے اور نہ

اپنی شان اور اپنا فخر دکھانے کی نظر سے' بلکہ نہایت عاجزی اور غریبی اور خاکساری اور دلی نیکی اور روحانی ہمدردی سے تاکہ ہماری فانی دولت' ہماری قلب نما عزت' ہمارا جھوٹا ظاہری فکر اس کے اثر کو لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جانے سے روک نہ دے۔

اب یہ بات غور طلب ہے کہ جو قومیں زمانہ حال میں یہ فخر اور امتیاز رکھتی ہیں اور جو قومیں اگلے زمانے میں رکھتی تھیں انہوں نے کس طرح اپنے ملک میں عام علم اور عام تربیت کو پھیلایا۔ سب کے سب نے بالاتفاق اپنی اپنی زبانوں میں علم کے پھیلانے سے وہ بڑائی اور بزرگی حاصل کی۔

ہندو' فرض کرلو کہ' تمام علموں کے موجد تھے اور انہوں نے کسی اور قوم سے نہیں لیا تھا' اور یہ بھی مان لو کہ جس طرح کہ درحقیقت وہ یونانیوں کے احسان مند نہیں ہیں' اسی طرح وہ مصریوں کے بھی احسان مند نہیں ہیں' تاہم یہ بات ماننی پڑے گی کہ انہوں نے زیادہ تر تحقیقات اور زیادہ واقف کاری کے لیے اجنبی قوموں کے علوم کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ پانچویں صدی میں ہندو یونانیوں سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ ان کے کلام کو ادب سے لحاظ کرتے تھے۔ روما کا سدھانتا سے ثابت ہے کہ انہوں نے رومیوں کے علم ہیئت پر توجہ کی تھی۔ غیر قوم کی سند سے ثابت ہے کہ ہندوؤں نے غیر قوم کے علوم و مسائل اپنی زبان میں ترجمہ کیے تھے۔ چنانچہ شت دساتیر کی شرح میں جو آتش پرستوں کی کتاب آسمانی ہے' ساسان پنجم نے شنکر اچارج کا نام بلفظ چکر نگاجہ اور اس کے وہاں جانے اور ان کے علم الہیات کا اپنی زبان میں ترجمہ کر کر لے جانے کا ذکر لکھا ہے۔

یونانیوں نے بہت بڑا حصہ علوم و تربیت کا مصریوں سے پایا تھا اور اس بڑی دولت کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے رواج دینے سے ملکی فخر و امتیاز حاصل کیا تھا۔

مسلمانوں نے جو یہ فخر و امتیاز حاصل کیا' انہوں نے یہی عام علوم کو یونانی زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کر کر رواج دینے سے حاصل کیا۔ خلیفہ منصور نے یونانی زبان سے عربی زبان میں علوم کے مترجموں کو بہت بڑے بڑے انعام دیے۔ خلیفہ ماموں نے روم' شام' جرمنی' مصر سے یونانی کتابیں منگا کر اپنی زبان میں ترجمہ کیں۔ حنین عبادی جو ایک عالم عیسائی نسطوری فرقے کا تھا علم طب کا مترجم تھا تاریخ سے ثابت ہے کہ سنسکرت زبان کی کتابیں بھی اس نے اپنی زبان میں ترجمہ کرائیں...

ان تمام حالات سے جو میں نے بیان کیے' بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جو قوم تربیت و شائستگی میں ترقی پائی ہوئی تھی اس قوم کے تمام علوم اس کی زبان میں تھے۔ اور جس قوم نے تربیت و شائستگی میں ترقی پانے کا ارادہ کیا' اس قوم نے تمام علوم کو اپنی زبان میں کر لیا۔

تعلیمی ترقی اور اخلاقی تربیت

سرسید کی اس تقریر سے اقتباس جو انہوں نے دسمبر 1893ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آٹھویں سالانہ اجلاس میں کی تھی۔

مرتب

میں قوم کو صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جو چھوٹے چھوٹے کام انہوں نے قوم کی بھلائی کے خیال سے شروع کیے ہیں' وہ قوم کو بجائے نفع کے شدید نقصان پہنچا رہے ہیں اور بعوض اس کے کہ قوم کے خیالات کو' اس کی ہمتوں کو' اس کے جوشوں کو ایک جگہ جمع کریں' پریشان و متفرق کر رہے ہں اور بے سود ضائع کرتے ہیں

میں صاف صاف جتلانا چاہتا ہوں کہ جو کام تم نے بغرض ثواب آخرت اختیار کیے ہیں' ہر شخص کو ثواب کمانے کا اختیار ہے' کوئی مانع نہیں' مگر تم نے جو اس کو قومی ہمدردی اور قومی بھلائی کا لباس پہنایا ہے' وہ صرف دھوکا ہے اور قوم کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ قوم کو دھوکا مت دو۔ یہ قوم کے ساتھ دغابازی اور مکر ہے جس سے قوم دھوکے میں پڑ کر برباد ہو جائے گی۔

میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ قوم کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ قوم کو بہت چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال ایسے مریض کی ہے جو متعدد امراض میں مبتلا ہو۔ بعض ایسے امراض ہیں جن سے اس کی ہلاکت کا اندیشہ نہیں۔ بعض ایسے ہیں جن سے اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ پس اگر تم ان امراض کے علاج پر متوجہ ہو گئے جن سے ہلاکت کا اندیشہ نہیں اور سب مل کر اس مہلک مرض کے علاج پر متوجہ نہ ہوئے' اور جو ایسا مرض ہے کہ بغیر اس کے کہ سب ایک دل ہو کر اس کے علاج پر متوجہ ہوں' علاج پذیر نہیں ہے' اور چند آدمیوں کے متوجہ ہونے سے اس کا علاج ہو نہیں سکتا' تو اس بیمار کو شفا ہونے کی توقع نہیں ہے بلکہ آخر کار یقینی اس کے لیے موت ہے۔

پس اگر تم اس کی شفا چاہتے ہو تو ایک دانا طبیب کا سا کام کرو۔ چھوٹے چھوٹے امراض کو'

جو درحقیقت اصلی مرض نہیں بلکہ اصلی مرض کے سبب سے پیدا ہوئے ہیں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور سب متفق ہو کر اصلی مہلک مرض کے علاج پر پوری پوری متفقہ ہمت مصروف کرو تاکہ اصلی مرض زائل ہو اور بیمار شفا پاوے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مرض بھی مہلک مرض کے شفا پانے کے ساتھ از خود زائل ہو جاویں گے۔

اب غور کرو کہ قوم کی فلاح اور بہبودی کے لیے ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی قوم کو انگریزی زبان کی تعلیم دینا ہے جس کے جانے بغیر ہم دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے، بلکہ میں کہوں گا کہ دین کی بھی خدمت نہیں کر سکتے، مگر ایسی تعلیم جس سے قوم کو کرُمٹر (اور بازاری) انگریزی آجاوے اور اس طرح سے وہ انگریزی بولنے لگیں جیسے ہندوستان میں کمپوں کے خدمت گار یا سوداگر یا انگلستان کے قلی اور کیب مین، تو قوم کو کچھ فائدہ نہیں۔ ان کو پوری تعلیم اور اعلیٰ درجے کی انگریزی زبان کی تعلیم ہونی چاہیے کہ خود اپنی لٹریچر دانی سے ان کو عزت ہو اور اس کو قومی، دنیاوی، مذہبی کاموں میں کام لاسکیں اور لوگ ان کی قدر کریں۔ اسی قدر ہمارے لیے کافی نہ ہو گا بلکہ یہ بھی ضروری ہو گا کہ انہی میں چند ایسے بھی ہوں جو فرنچ، جرمن، لٹین اور گریک کو بخوبی جانتے ہوں۔

اسی کے ساتھ ہم کو عربی کی بھی تعلیم دینی ضرور ہے جو قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے، ایک ایسی اعلیٰ درجے کی زبان ہے جس کی قدر کی جاسکتی ہے اور کسی طرح علمی زبان کے دائرے سے علیحدہ نہیں رہ سکتی اور مسلمانوں کی ضروریات سے خارج نہیں ہو سکتی۔ اور اگر مذہبی خدمت کا بھی لحاظ ہو تو عربی کے ساتھ عبری زبان سے بھی واقفیت پیدا کرنی لازم آجاتی ہے۔ ایک مجمع میں مولانا شاہ عبدالعزیز مرحوم نے چار سطریں توریت کی شروع کیں۔ نہایت فخر سے عبری زبان میں پڑھیں اور نواب فتح اللہ بیگ خاں نے، جو شاہ صاحب کے نہایت معتقد تھے، ان کو یاد کر لیا تھا۔ اور کبھی کبھی شاہ صاحب کے حالات بیان کرنے میں ان کو پڑھا کرتے تھے۔

فارسی کو بھی ہم نہیں چھوڑ سکتے، جس کا تعلق بہت کچھ مسلمانوں کی تربیت اور مذاق کے ساتھ ہو گیا ہے، اور وہ فی نفسہ خود بھی نہایت لطیف و بامذاق زبان ہے اور مسلمانوں کے علوم اور تواریخ کا اس قدر سرمایہ اس میں موجود ہے جس سے مسلمان قطع نظر نہیں کر سکتے۔

مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دینا بھی ادنیٰ درجے کی یا اوسط درجے کی یا اعلیٰ درجے کی ہم پر فرض ہے کیوں کہ مختلف اقوام کو جس چیز نے ایک قوم بنا دیا ہے وہ صرف اسلام ہے۔ اگر ہم اسی کا فکر نہ رکھیں تو قومیت قائم نہیں رکھ سکتے۔ کم سے کم یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو صرف ضروری عقائد مذہبی اور احکام مذہبی کی تعلیم دیں جس کو ہم نے ادنیٰ تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔

ان سب باتوں کے ساتھ ہمیں ان کو مختلف علوم میں اور بالتخصیص علوم جدیدہ میں تعلیم دینا ہے جو ایک بہت بڑا امر اہم ہے۔ اور فی الواقع جو اس کی ضرورت اور عظمت ہے' وہ مافوق بیان ہے۔ مختصراً" اس طرح بیان ہو سکتی ہے کہ بغیر اس کے نہ قوم بن سکتی ہے نہ دنیا میں کوئی درجہ اور عزت اور قدر حاصل کر سکتی ہے اور اگر سچ پوچھو تو نہ دین کی خدمت کر سکتی ہے۔

یہ حالت تو صرف تعلیم کی تھی مگر صرف تعلیم سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیا صرف تعلیم سے انسان انسان بن جاتا ہے؟ اور کمثل الحمار یحمل اسفارا سے زیادہ مرتبہ پا سکتا ہے؟ کیا صرف تعلیم سے قوم قوم بن جاتی ہے؟ کیا صرف تعلیم سے قوم' دنیا کی قوموں میں عزت پا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ جب تک وہ انسان نہ بنیں اور قوم قوم نہ بنے اس وقت تک معزز نہیں ہو سکتی۔

پس ہم کو مسلمانوں کے لیے تعلیم سے زیادہ وہ چیز کرنی ہے جس کو ہم تربیت کہتے ہیں اور قوم کو قوم بننے کے لیے ایسی ہے جیسے جان بدن کے لیے۔ اور بغیر اس کے قوم کا قوم بننا اور زندہ قوم بننا محالات سے ہے۔

اس مطلب کے لیے ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ اول ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ قوم کے بچوں' نوجوانوں کو جس قدر ہو سکے ہم ایک جگہ جمع کرلیں۔ وہ ساتھ رہیں' ایک جگہ سوئیں' ایک جگہ کھیلیں' ایک جگہ جئیں' ایک جگہ پڑھیں' ایک جگہ کھاویں' ایک جگہ جاگیں' ایک جگہ مریں۔ اسی کے ساتھ ان کی تربیت کا کافی سامان مہیا کریں۔ ان کی صحت جسمانی کا خیال رکھیں۔ علاوہ تمام اسباب و سامان معالجہ کے مہیا رکھنے کے ایک مکان وسیع' خوش آب و ہوا پر فضا مہیا کرنا چاہیے جس میں ان کو رکھا جاوے۔ انہیں ایسے کھیلوں کو اور ورزشوں کی رغبت دلائی جاوے جو صحت جسمانی کے لیے ضرور ہوں۔ پھر ان کے قویٰ پر نظر ڈالی جاوے اور ایسی ورزشیں ان کو بتائی جاویں جو ان کے قویٰ کے مناسب ہوں۔ جو کمزور ہوں ان کے لیے ایسی ورزشیں تجویز کی جاویں جو ان کی جسمانی قوت کی کمی کو پورا کریں' اور جو قوی اور طاقتور ہیں ان میں زیادہ قوت اور طاقت پیدا ہو۔ گھوڑے کی سواری کی تعلیم ہو اور ان میں جرات اور دلیری پیدا کی جاوے جس کے بغیر انسان نہ دین کے کام کا ہوتا ہے' نہ دنیا کے کام کا۔

پھر ان کے لیے تفریح کے سامان مہیا رکھنے چاہیں تاکہ ان کی طبیعت پژمردہ نہ ہونے پاوے اور ان کی امنگیں مٹ کر معدوم نہ ہو جاویں۔ صرف ان پر اس قدر بندش رہے کہ ان کی امنگیں بدراہ پر نہ پڑنے پاویں اور سیدھے اور نیک رستے پر پڑ جاویں۔

پھر اس سب کے ساتھ اس کا خیال رہے کہ یہ کھیل کود اور ورزشیں تعلیم میں اور لکھنے

پڑھنے میں حارج نہ ہوں بلکہ اس کے ممد و معاون ہوں۔ تعلیم کے ایسے سامان مہیا کرنے چاہئیں جن سے ان کو شوق اور رغبت اور ان کے دل کو خوشی ہو اور اس میں شریک ہونے کا اور جو کچھ انہوں نے پڑھا ہے اس کو ترقی دینے کا ان کو شوق پیدا ہو۔ درخت کو صرف پانی ہی دیئے جانا کافی نہیں ہے' جب تک کہ اس کے پتے اور ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے ہلتی جلتی اور لہلہاتی اور ہوائے محیط کو اور اس کے اجزا کو جذب کرتی نہ رہی' کبھی پھول پھل نہیں لا سکتے۔

ان کے اخلاق اور مذہبی خیالات درست رکھنے کو' فرائض مذہبی ادا کرنے کو' اس ماحول کے ساتھ ایک یا دو مقدس باوقار پاکیزہ صورت' پاکیزہ سیرت سمجھ دار مقدس عالم کو رکھنا چاہیے جس کا ادب لوگوں کے دلوں میں ہو تاکہ ان کے فیض صحبت سے ان کی طبیعتیں از خود نیکی اور دین داری کی طرف مائل ہوں۔

طب یونانی کی ترقی کے لیے تحریک

سرسید احمد خاں نے یہ تقریر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ میں 29 دسبر 1891ء کو کی

مرتب

جناب صدر انجمن! اس وقت اس رزولیوشن پر نہایت عمدہ گفتگوئیں ہوئیں اور طب یونانی کی حقیقت نہایت قابلیت سے حکیم عبدالمجید خاں صاحب نے بیان کی۔ ہمارے عزیز اور مخدوم نواب صاحب نے جو وسیع گفتگو کبھی کبھی دلی محبت اور دلی جوش پر مبنی تھی، لیکن میں اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی طب پر خواہ یونانی ہو، خواہ انگریزی، خواہ ہومیو پیتھک، جو اس زمانے میں بہت مروج ہے، بحث کروں یا ترجیح دوں۔ ہمارا کام، جو اتنے آدمی یہاں ہیں، ان کا یہ ہے کہ اپنی قوم اور ملک کی جس میں بہتری ہو یا ضرورت ہو اس کو حل کریں۔ اس وقت جتنے طریقے علاج کے جاری ہیں اور جن کو کوئی پسند کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ملک کو طب یونانی کی طرف کہاں تک رغبت ہے۔ اس وقت کسی قصبے میں چلے جاؤ، گروہ کے گروہ ملیں گے جو یونانی طب کے خواہش مند ہیں۔ ہر گاؤں اور ہر شہر میں ہم دیکھتے ہیں کہ عام خواہش علاج یونانی کی ہے۔ ان کی خواہش پوری ہوتی ہے، مگر بعوض بھلائی کے برائی پہنچتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ جاہل لوگ اپنے آپ کو طبیب کہہ کر ناواقفوں کو دام میں گرفتار کرتے ہیں اور حقیقت میں علاج کرنا نہیں جانتے۔ غریب لوگ ان کو طبیب سمجھتے ہیں۔ اس مضرت کو دور کرنا میرے نزدیک قوم اور ملک کو، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ضرور ہے۔ سب کو شریک ہو کر اس مصیبت اور نقصان کے رفع کرنے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ وہ اسی طرح رفع ہو سکتی ہے کہ ہم ایک مدرسہ قائم کریں جس میں طب یونانی کی تعلیم دے کر بہت طالب علم، جو علاج کے قابل ہوں، پیدا کر کے منتشر کر دیں۔ منتشر کرنے میں ہم کو کوشش کی ضرورت نہ ہوگی۔ جب موجود ہو جاویں گے وہ از خود منتشر ہو جاویں گے۔ ہمارا کام اپنی قوم اور ملک کی بھلائی کے لیے یہ ہے کہ ایک ایسی جگہ قائم کر دیں جہاں سے پڑھے لکھے اور طب یونانی کے جاننے والے لوگ پیدا

ہوں۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں جو حکیم عبدالمجید خاں نے کہا ہے۔ دہلی مدت دراز سے مخزن طب یونانی کا ہے اور کوئی شہر اور قصبہ ایسا نہیں جس نے دہلی کے حکماء سے فیض نہ پایا ہو۔ اس وقت حکیم عبدالمجید خاں کو جو کچھ فخر ہو بجا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس شہر کے ہر ایک شخص کو جو خاندان حکیم سے علاقہ رکھتا ہے، متفق ہو کر اس کام کو چلانا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ کسی خاص خاندان کا کام نہیں ہے بلکہ حکمائے دہلی کے خاندانوں کا کام ہے۔ اس کو چلائیں اور غربا کی مدد کرنے کو اپنا فرض سمجھ کر اس مدرسے کی تائید کریں۔ حکیم عبدالمجید خاں کو، جیسا نواب صاحب نے فرمایا، نہایت بوجھ ان کے سر پر پڑ گیا۔ سب سے بڑا یہ ہے کہ سینکڑوں آدمی ان سے رجوع کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک نسخے اور دوا دینے میں گزر جاتا ہے۔ ہمارے دہلی کے طبیبوں اور علی الخصوص جناب حکیم محمود خاں مرحوم والد عبدالمجید خاں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ بیمار فقیر سے فقیر ہو، چمار یا حلال خور ہو، امیر سے امیر ہو، کوئی فرق علاج میں نہیں کرتے تھے۔ خدا بخشے حکیم احسن اللہ خاں کو، جو بادشاہ کے ہاں بڑے حکیم تھے۔ ایک روز بادشاہ کے ہاں پالکی میں جاتے تھے۔ ایک حلال خور نے کہا کہ میری جورو بیمار ہے۔ پالکی میں سے اترے اور جا کر مریضہ کو دیکھا اور نسخہ لکھ دیا۔ یہ خاص صفت ہمارے اس ویران دہلی کے خاندانوں کی ہے۔ میں بھی مدت سے دہلی میں رہتا تھا۔ مجھ کو یاد نہیں کہ ہمارے حکیم، جو لوگوں کے گھر جاتے تھے، وہ ایک پیسہ بھی کسی مسلمان سے لیتے ہوں۔ وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ہم حکیم ہیں اور علاج کرنا ہمارا فرض ہے۔ وہی طریقہ حکیم عبدالمجید خاں کا جاری ہے۔ غرض اس وقت ضرورت ملک کو اس بات کی ہے کہ ہم متعدد طب جاننے والے لوگ پیدا کریں اور جو ضرورت ملک کی ہے وہ رفع ہو۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آنریری مدرس ہوں۔ ضرور چاہیے کہ سب تنخواہ دار ہوں تاکہ سب اپنا فرض اچھی طرح ادا کریں۔ اس وقت مجبوری یہ ہے کہ روپیہ نہیں ہے۔ اس واسطے حکیم صاحب پڑھاتے ہیں۔ اس وقت جیسا چلتا ہے چلنے دو اور دیکھو کہ آئندہ خدا کیا کرتا ہے۔ روزولیوشن جس طرح پیش ہوا ہے، میں تحریک کرتا ہوں کہ پاس جاوے۔

انجنئرنگ کے کارنامے

ان خیالات کا اظہار سرسید نے 13 جولائی 1869 کو لندن میں سمٹونین سوسائٹی آف سول انجینئرز کے جلسہ میں کیا

مرتب

ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے رعب و داب اور دبدبے کے پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں مثلاً" تعلیم' اسلحہ اور عدل و انصاف وغیرہ۔ مگر یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ صرف ان ہی لوگوں کے دلوں میں ان کی وقعت ہوتی ہے جن کو ان سے کام پڑتا ہے' یا جن کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن وہ شے جس نے خاص و عام سب کے دلوں میں انگریزی گورنمنٹ کی عظمت پیدا کی ہے' وہ فن انجینئری کے اعلیٰ نتائج ہیں۔ جیسے ریل' دریاؤں کے پل' نہریں اور لمبی لمبی پہاڑی سرنگیں جن میں سے ریل گزرتی ہے۔ ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور فن انجینئری کے یہ کمالات دیکھ کر حیران اور ششدر رہ جاتا ہے۔ یہی انجینئری کے کرشمے اور کارنامے ہیں جن سے ہر شخص کے دل میں خود بخود انگریزی سلطنت کا رعب و داب اور اس کی بڑائی اور بزرگی پیدا ہوتی ہے۔

مسلمان کی تعلیم
دین و دنیا کا امتزاج

سرسید احمد خاں نے 16 اکتوبر 1983ء کو یہ تقریر کلکتہ میں کی جو اس وقت ہندوستان کا دارالحکومت تھا۔ سرسید کی یہ تقریر فارسی میں تھی، اس کا یہ اردو ترجمہ محمد اسمٰعیل پانی پتی کا کیا ہوا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں بلکہ سرسید کی ترجمانی ہے

یہ جلسہ خان بہادر مولوی عبداللطیف کے مکان پر ہوا تھا اور سرسید نے غالباً پہلی بار اس قدر تفصیل سے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا

مرتب

میں اس موقع پر حسد نہیں بلکہ رشک کرتا ہوں کیونکہ میں تمام بنی نوع انسان کا خیر خواہ اور بہی خواہ ہوں کہ ہمارے دوسرے اہل ملک نے اس بات کو سمجھا اور وہ دل و جان سے انگریزی کی تحصیل میں مصروف ہو گئے۔ وہ ہم سے تمدنی اور ثقافتی دوڑ میں بہت آگے بڑھ گئے اور ہم ان سے پیچھے رہ گئے، اور اس وقت بھی وہ اس میدان میں ہم سے برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اشد ضرورت ہے کہ ہم پورے جوش اور پوری ہمت کے ساتھ ان کے مقابلے کو نکلیں اور تیزی کے ساتھ اس میدان میں ان سے آگے بڑھ جائیں۔ ہم ماضی میں علم کی تحصیل اور فنون کے حصول میں دنیا کی تمام اقوام سے آگے نکل گئے تھے، لہٰذا اب بھی ہم کوشش کر کے اپنے اہل ملک اور اپنے ہمسایوں سے آگے نکل جائیں۔

میں بے شک اس بات کا موید ہوں کہ اس زمانے میں مسلمانوں کو بڑے زور و شدت اور بڑے ذوق و انہماک کے ساتھ انگریزی کی تحصیل میں کوشش اور سعی کرنی چاہیے۔ مگر میں ساتھ ہی بڑے زور سے یہ بات بھی کہوں گا کہ میرے مسلمان بھائی ہرگز عربی کا دامن نہ

چھوڑیں۔ انگریزی کی تحصیل ہمیں حاکموں اور افسروں سے ملاتی ہے جبکہ عربی کا حصول ہمیں خدا اور اس کے رسولؐ سے ملاتا ہے۔

اس بات سے دونوں زبانوں کے فرق کو معلوم کر لو اور دونوں کی تحصیل میں پوری کوشش کے ساتھ مشغول ہو جاؤ' تاکہ تمہاری دنیا بھی ٹھیک ہو جائے اور تمہارا دین بھی درست ہو جائے۔ انگریزی کی طرف متوجہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم تمدنی لحاظ سے نہایت پسماندہ ہو جائیں گے اور عربی کی تحصیل سے غفلت برتنے کے باعث ہم اپنے مذہب' اپنی ثقافت' اپنی سابقہ تہذیب' اپنے گزشتہ تمدن اور اپنی پچھلی شائستگی سے قطعاً" ناواقف رہیں گے۔ پس دونوں کھونٹے مضبوط پکڑو' عربی بھی حاصل کرو اور انگریزی بھی سیکھو' جب ہی تم سچے مسلمان اور اعلیٰ درجے کے متمدن اور مہذب تعلیم یافتہ انسان بن سکتے ہو۔ ہماری موجودہ حالت نہایت افسوس ناک اور رنج دہ ہے۔ پس کیا ہم اپنے عزیز مسلمانوں کو اس ذلت اور جہالت کی حالت میں چھوڑ دیں یا ان کو ترقی و عروج کی ترغیب دلائیں؟ ظاہر ہے کہ ہمدردی خلق اور خیر خواہی ملت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو جہاں تک ہو سکے علم کی تحصیل کی ترغیب دیں اور اس کوشش میں اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دیں۔ پس میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ اے ہماری قوم کے سردارو! اٹھو اور اپنی پسماندہ قوم کی تہذیب و ترقی کے سامان فراہم کرو' کیوں کہ ہماری بدقسمت قوم اگر اب بھی نہ سنبھلی تو پھر کبھی بھی نہیں سنبھلے گی' اور دن بدن اور روز بروز ذلت کے تاریک گڑھے میں گرتی چلی جائے گی۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔

اس مرحلے پر ہمیں ایک اور مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ جدید علوم و فنون کی تحصیل کے بعد ہمارے مسلمان نوجوان مذہب سے بیگانہ اور دین سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ان میں مذہب کی محبت اور اسلامی عقائد کی الفت باقی نہیں رہتی۔ وہ دین کو فضول اور اسلامی عقائد کو ایک کھیل سمجھنے لگتے ہیں اور جلد ہی ایمان و عقائد سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف خالی اندیشہ ہی نہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے میں آئی ہوئی بات ہے....

صاحبان! میرا یقین ہے اور غالباً" آپ بھی مجھ سے اس امر میں متفق ہوں گے کہ اگر مسلمان نوجوانوں کو جدید علوم و فنون اور انگریزی زبان کی تعلیم عربی زبان اور اسلامیات کی تدریس کے ساتھ دی جائے تو بہت حد تک امید کی جا سکتی ہے کہ طلباء میں بے دینی' الحاد اور لامذہبیت کا مادہ پیدا نہیں ہو گا' اور وہ اپنے مذہب اور عقیدے پر پختہ اور مضبوط رہیں گے۔

ہمارے علما پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی فلسفہ جدید کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں نکلیں۔ یا تو جدید فلسفے کو باطل ثابت کریں یا اسلامی مسائل کو جدید فلسفے سے مطابق کر کے

دکھائیں۔ اس دور میں ہمارے علما کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو فلسفہ جدیدہ کے بد اثرات سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے پوری جدوجہد سے کام لیں تاکہ ہمارے نوجوان سچے اور پکے مسلمان بنیں اور اسلام کے ایسے ہی والہ وشیدا ہوں جیسے ان کے آبا و اجداد تھے۔

اگر ہم اس طرح اپنی قوم کے نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ مسلم طلبا کی تربیت کر سکیں تو میں نہایت پختہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے ہماری قوم کو بے اندازہ فوائد حاصل ہوں گے اور مسلمان زبردست ترقی کر کے ایک مہذب' شائستہ اور تعلیم یافتہ قوم بن جائیں گے۔ اس وحشت و جہالت کا یکسر خاتمہ ہو جائے گا جس میں ہمارے قدیم خیالات کے مسلمان بری طرح مبتلا ہیں۔

میں نے اپنی زندگی' اپنا وقت اور اپنا روپیہ قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور میں دن رات اس فکر میں ڈوبا رہتا ہوں کہ کس طرح میری قوم جہالت کے عمیق گڑھے سے نکل کر تہذیب کی اعلیٰ بلندیوں تک پہنچے' اور اپنی موجودہ ذلت کو محسوس کر کے ترقی و عروج کے زینے پر چڑھ کر اس کی انتہائی بلندی تک رسائی حاصل کرے۔ اس امر کے حصول کے لیے اپنا وقت' اپنا روپیہ اور جو کچھ میرے پاس ہے' سب کا سب قوم پر قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ مگر اے صاحبان ذی شان! میری حالت اس غریب بڑھیا جیسی ہے جو سوت کی ایک انٹی لے کر حضرت یوسفؑ کو خریدنے کے لیے مصر کے بازار میں گئی تھی۔ میں تنہا' کمزور اور بے کس انسان ہوں اور کچھ صلاحیت اور لیاقت نہیں رکھتا۔ جب تک پوری قوم میری مدد نہ کرے اور تمام مسلمان کمر ہمت باندھ کر اپنے بھائیوں کی امداد اور اعانت کے لیے میدان میں نہ آئیں' اس وقت تک میں اکیلا اور تنہا انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ جب تک قوم کا ہر فرد اور مسلمانوں کا ہر شخص ہمت اور جرات سے کام نہ لے اور جب تک ہر مسلمان اپنے ہاتھ' زبان' قلم اور روپے پیسے سے اپنے بھائیوں کی ترقی و تہذیب میں امداد نہ کرے اس وقت تک قوم کبھی عروج حاصل نہیں کر سکتی۔

پس میں اسی غرض کے لیے آپ صاحبان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں اپنے اصلاحی کام کو چلانے اور بڑھانے کے لیے آپ صاحبان کی امداد اور اعانت کا محتاج ہوں۔ اور مجھے یقین اور امید ہے کہ آپ مجھے مایوس اور ناامید نہیں لوٹائیں گے۔

مسلمانوں کے لئے ان کے تعلیمی ادارے

سرسید نے یہ تقریر 29 دسمبر 1873ء کو لاہور میں کی۔ یہ بہت طویل تقریر تھی۔ اس سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ سرسید ہر قیمت پر اسلام اور اسلامی قدروں کو تعلیم سے وابستہ کرنا چاہتے تھے۔ دین کے بغیر تعلیم ان کے لئے بے معنی تھی اور اس لیے وہ سرکاری اسکولوں اور تعلیمی اداروں کی جگہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کا جال برصغیر میں پھیلانا چاہتے تھے۔

پنجاب نے سرسید کی آواز پر یوں لبیک کہا کہ سرسید نے "زندہ دلانِ پنجاب" کا خطاب انہیں دیا اور یہ خطاب پنجابیوں کی شناخت بن گیا۔

مرتب

اگر ہماری قوم اس ضرورت پر خیال کرے، جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے ہے اور یہ بھی ہماری قوم کے دل میں کسی طرح سما جاوے کہ نہایت عمدہ اصول پر مدرسۃ العلوم قائم کیے بغیر ہماری اولاد کی تعلیم و تربیت غیر ممکن ہے، تو ایک مدرسۃ العلوم کیا، بیسوں مدرسۃ العلوم قائم ہو سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہماری قوم سمجھے اور اس طرف متوجہ ہو۔

ان مکتبوں کے سوا سرکاری مدرسے ہیں اور پنجاب میں بالخصوص ایشیا کی زبانوں کی ترقی کرنے کا بھی بندوبست ہے۔ جو بزرگ ہماری رائے کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سرکاری مدرسے ہمارے لیے کافی ہیں۔ مگر ان کا دل خوب جانتا ہے کہ ہماری مخالفت ان سے یہ باتیں کہلواتی ہے، ورنہ وہ یقین جانتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی اغراض کے لیے یہ سرکاری مدرسے کافی نہیں ہیں۔ اگر میں اس کی تفصیل اور وجوہات اور ان کے اسباب کا بیان کروں کہ کیوں یہ سرکاری مدرسے ہماری اغراض کے لیے کافی نہیں تو بہت لمبی گفتگو ہو جاوے گی اور مجھے خوف

ہے کہ میں اس کو آج ختم بھی نہ کر سکوں گا۔ مگر میں ایک نتیجے پر آپ صاحبوں کو متوجہ کرتا ہوں جس سے تصفیہ ہو جاوے گا کہ یہ سرکاری مدرسے ہماری دینی و دنیاوی اغراض کے لیے کافی ہیں یا نہیں۔ پس میں سوال کرتا ہوں کہ ہماری قوم کے لوگ ان سرکاری مدرسوں سے دل سے وابستہ ہیں؟ نہیں۔ ہماری قوم کے لڑکے بقدر تعداد واجب ان مدرسوں میں جاتے ہیں اور تعلیم پاتے ہیں؟ نہیں۔ ہماری قوم کے لڑکوں نے سوائے دو تین کے' ان مدرسوں کی بدولت یونیورسٹی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں؟ نہیں۔ کوئی انجینئر بنا ہے؟ نہیں۔ کسی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری پائی ہے؟ نہیں۔ کسی نے ان مدرسوں میں علم ادب ایسا سیکھا ہے جو ادیب کہلایا جا سکتا ہو؟ نہیں۔

پس جب کہ یہ نتیجہ ہے تو صاف ثابت ہے کہ کچھ تو ان مدارس میں ایسی بات ہے جو ہماری اغراض کے لیے کافی نہیں۔ ورنہ ہم لوگ ان کے گرویدہ ہوتے اور جن سوالوں کا جواب "نا" ہوا ہے سب کا "ہاں" ہوتا۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ ہماری قوم کے جن لوگوں نے ان مدرسوں میں تعلیم پائی ہے آخر کچھ بھی انہوں نے کیا ہے؟ ہاں یہ کیا ہے کہ کسی اسکول میں انہیں پڑھی ہوئی کتابوں کو طوطے کی طرح پڑھانے کے لیے یا کسی دفتر میں چٹھیات کے اس طرح نقل کرنے کے لیے، جس کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آسکے' لیاقت پیدا کی ہے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ بعض تو اپنے مذہب کا ایک مسئلہ تک نہیں جانتے اور بعض مذہب ہی کو سلام کرتے ہیں۔ پس اب انصاف کرو کہ کیا یہ بات سچ ہے کہ یہ مدرسے ہماری تمام اغراض کے لیے کافی ہیں اور کیا ان مدرسوں کی تعلیم سے ہم کو اپنی قومی عزت و قومی ترقی کی توقع ہے؟

ہرگز نہیں' ہرگز نہیں۔ اے صاحبان!... عمدہ تعلیم و تربیت ہی قومی عزت اور قومی ترقی کا اصلی ذریعہ ہے۔ مگر کوئی قوم عزت نہیں پا سکتی' جب تک کہ تعلیم ایک مقدار مناسب سے اس قوم میں رائج نہ ہو اور اس مقدار مناسب کا اندازہ حسب تفصیل ذیل ہو سکتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس قوم میں ایک گروہ معتدبہ اعلیٰ درجہ تعلیم کا ایسا پیدا ہو' جس میں سے کوئی کسی علم میں اور کوئی کسی علم میں دست گاہ کامل رکھتا ہو۔ اور دل سے اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جو سعی و کوشش گورنمنٹ نے ہندوستان کی تعلیم پر کی ہے' وہ ایسی ہے جس کی مثال دنیا میں اور کسی عمل داری میں موجود نہیں ہے۔ تمام رعایائے ہندوستان کو گورنمنٹ کی اس فیاضی اور مہربانی کا' جو اس نے بالخصوص تعلیم کے باب میں ہندوستان کی رعایا کی نسبت کی ہے' دل و جان سے شکر گزار ہونا چاہیے۔ گورنمنٹ انگلشیہ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کی رعایا پر حکومت کرتی ہے اور اس لیے اس کو طریقہ تعلیم ایسا اختیار کرنا فرض ہے جو بالکل ناطرف دار ہو اور اس نے ایسا ہی طریقہ اختیار کیا ہے... مگر مسلمانوں کی تعلیم کا حال اور قوموں کی تعلیم سے'

جو ہندوستان میں آباد ہیں، بالکل مختلف ہے۔ ان کا مذہب، ان کی مذہبی تعلیم، عام تعلیم میں ایسی ملی ہوئی ہے کہ جیسے جسم و جان۔ جب اس کو علیحدہ کیا جاوے گا، بے جان رہ جاوے گا، اور کبھی اس قسم کی بے جان تعلیم سے ہماری تمام اغراض پوری نہ ہوں گی۔ برخلاف ہندوستان کی اور قوموں کے کہ ان کے یہاں مذہبی تعلیم، عام تعلیم سے بالکل علیحدہ ہے۔۔۔ گورنمنٹ تمام مذہبی تعلیم سے اپنے مدارس میں دست کش ہے۔ اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ پس گورنمنٹ کے مدارس، ہندوستان کی، اور قوموں کے اغراض پورا کرنے کے لیے نامناسب نہیں ہیں۔ مگر مسلمانوں کے تمام اغراض پورا کرنے کو محض ناکافی ہیں اور یہی باعث ہے کہ ہم لوگ ان سے وابستہ نہیں ہیں

ان تمام حالات پر غور کر کے ایک گروہ مسلمان نے، جس گروہ کا میں خادم ہوں، یہ تجویز کی ہے کہ ایک مدرسۃ العلوم مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کیمبرج اور آکسفورڈ کے نمونے پر قائم کیا جاوے، جس میں علوم دینی و دنیاوی اور وہ تمام علوم جن کی تعلیم قومی ترقی اور قومی عزت کا باعث ہو، تعلیم دیے جاویں۔ اور مسلمانوں لڑکوں کی تربیت کا طریقہ بھی، جو تعلیم سے بھی زیادہ ضرور ہے، اس میں نہایت عمدگی سے ملحوظ رکھا جاوے۔۔۔

طالب علموں کو، جو اس سلسلہ تعلیم میں داخل ہوں گے، علوم مذہبی کی بھی تعلیم دی جاوے گی۔ سُنیوں کو موافق اصول اہل سُنت و جماعت کے اور شیعوں کو موافق اصولِ مذہبِ امامیہ اثنا عشریہ کے مذہبی تعلیم کا اہتمام خاص ممبروں سے متعلق ہو گا، جو اس کام کے لئے منتخب کیے جاویں گے۔۔۔

جو کہ (چونکہ) ایک ایسا بڑا قومی کام بغیر امداد تمام قوم کے اور بلا جمع ہونے سرمایہ کثیر کے غیر ممکن ہے، اس لئے تمام قوم سے اس کام کے انجام کے لیے چندہ دینے کی درخواست ہے۔۔ اپنی اولاد کے واسطے، اپنی قوم پر رحم کرو اور جو مقدور ہو اس کام کے انجام کے لیے چندہ دو۔۔ زر چندہ سے اس مدرسے کے لیے جائیداد خریدنی تجویز ہوئی ہے۔ جائیداد دو قسم کی ہوگی اول از قسم اراضی معافی یا دوامی اور دیہات مال گزاری۔ دوئم گورنمنٹ پرامیسری نوٹ۔ اگرچہ مدت ہوئی کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس منافع کو جو گورنمنٹ پرامیسری نوٹ سے حاصل ہوتا ہے مباح و جائز بتایا ہے اور ان کا تحریری فتویٰ لوگوں کے پاس ہے۔۔۔ الا بعض بزرگان اہل سنت و جماعت کو اس کے جواز میں کلام ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ جو صاحب چندہ دینے والے پرامیسری نوٹ کے خریدنے سے ممانعت کریں گے، ان کا چندہ نہایت احتیاط سے علیحدہ رہے گا اور بجز دیہات کے خریدنے کے اور کسی کام میں نہ لگایا جائے گا۔

... جابجا سب کمیٹیاں مقرر ہوتی جاتی ہیں اور قوم بھی اس کام پر کچھ کچھ متوجہ ہونے لگی ہے اور امید ہے کہ روز بروز چندے کو ترقی ہوتی جاوے گی۔ ارادہ ہے کہ دس پندرہ لاکھ روپیہ اسی طرح چندے سے جمع کیا جاوے۔ گورنمنٹ نے سرکاری طور پر بھی اس مدرسے کی امداد کا بموجب گرینٹ ان ایڈ کے وعدہ فرمایا ہے۔ پس جس قدر چندہ ہم جمع کریں گے اور جس قدر آمدنی اس سے پیدا کریں گے اسی قدر گورنمنٹ بھی عطا کرے گی... اس وقت کمیٹی کی نظر پنجاب کی سخاوت اور فیاضی پر ہے اور امید کرتی ہے کہ پنجاب کی فیاضی سے بہت کچھ فائدہ مسلمانوں کی قومی ترقی و قومی عزت کو ہو گا۔

مسلمانوں کی کمیٹی میں جس وقت کہ اس نیک کام میں سعی کر رہی تھی تو امید قوی تھی کہ ہر فرقے کے تمام مسلمان بلا لحاظ کسی باہمی اختلاف کے یا اختلاف رائے کے اور بلا خیال اختلاف مذہب کے باہم متفق ہو کر اس نیک کام کے انجام میں ممد و معاون ہوں گے۔ بڑا اندیشہ اس بات کا تھا کہ مبادا سُنی شیعہ بہ سبب اختلاف مذہب کے باہم کچھ اختلاف کریں۔ مگر خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ان دونوں فرقوں میں تو اس بات کا کچھ اختلاف نہیں ہوا۔ سُنی و شیعہ دونوں کمیٹی اسلامی کے ممبر ہیں اور دونوں ایک دل ہو کر اس کار خیر کے انجام میں ساعی ہیں۔ مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ سُنیوں ہی میں سے بعض لوگوں نے جو متعصب مجسم ہیں' اس کام سے اختلاف کیا ہے اور جہاں تک ان سے ہو سکا ہے' اس کام میں خلل ڈالنے اور اس میں ابتری کرنے کی کوشش کی ہے' اور کوئی دقیقہ اس قومی بھلائی کے معدوم کرنے میں اپنی دانست میں باقی نہیں چھوڑا۔ جابجا جھوٹے اور اتہام کے بھرے ہوئے رسالے تقسیم کیے ہیں' اور امید ہے کہ پنجاب میں بھی بہت آئے ہوں گے۔ مگر جن کے نام سے وہ رسالے آئے ہیں' ان کا نام ناحق اس معاملے میں تو صرف ایک پردہ ہے اور جتنی تحریریں ان کے نام سے چھپی ہیں' صرف ان کا نام ہی نام ہے۔ ورنہ دراصل ایک اور صاحب جو ان کی خدمت میں حاضر ہیں اور یہ سب تحریریں کرتے ہیں' انہوں نے چند میرے اقوال کو کسی قدر صحیح و کسی قدر تحریف کر کر ایک فتویٰ تحریر کرایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان اقوال کے سبب سید احمد کافر و مرتد ہے۔ مجھے اس میں کچھ کلام نہیں کیوں کہ میں ان کے کافر بنانے سے کافر نہیں ہو سکتا۔

تکفیر کا فتویٰ کچھ نئی بات نہیں ہے۔ کوئی شخص بزرگان دین میں سے بچا ہوا ہے' جس کی تکفیر کے فتوے نہیں ہوئے؟ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کافر بنائے گئے' جناب حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کافر قرار دیے گئے اور علماء ہی کے فتوے سے ان کی ریش مبارک نوچی گئی اور گوالیار کے قلعے میں قید ہوئے۔ اگر میں ان سب بزرگوں کے نام لوں' جن پر کفر کے فتوے

جاری ہوئے تو غالباً" کئی جز میں بھی ان کی فہرست ختم نہ ہو گی۔ پس جب کہ یہ حال ہے تو میں غریب کس گنتی میں ہوں۔ مجھ کو اپنی تکفیر کے فتوؤں کا نہ کچھ ڈر ہے نہ کچھ غم۔ مگر میں صرف اس جھوٹی بات کا ذکر کرتا ہوں' جو مدرستہ العلوم کی نسبت اس فتوے میں مندرج ہے۔ یہ وہ فتوے ہیں جو میرے ہاتھ میں ہیں اور یہ طریقہ تعلیم ہے' جو مدرستہ العلوم کے لیے کمیٹی میں پیش ہوا ہے۔ جو استفتا کیا گیا ہے اس میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ میں ایک شخص نہایت بد عقیدہ ہوں اور انہی بد عقیدوں کے موافق مذہبی تعلیم مدرستہ العلوم میں جاری کرنا چاہتا ہوں اور اس دروغ بے فروغ کو حقیقت واقع قرار دے کر سوال کیا ہے کہ ایسی حالت میں تاکید مدرستہ العلوم جائز ہے یا نہیں؟ پس یہ بات جو استفتا میں لکھی گئی ہے' ہر شخص کمیٹی کے روئدادیں دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ محض جھوٹ ہے۔ کمیٹی نے صاف صاف تجویز کیا ہے کہ جو مذہب شیعہ سنی کا ہے اور جو اصول ان کے مذہب کے ہیں اور جو کتابیں ان مذہبوں کی ہیں وہی مذہب اور وہی اصول اور وہی کتابیں مدرستہ العلوم میں پڑھائی جاویں گی۔ میرے بد عقیدہ ہونے یا نہ ہونے کی اس میں کچھ مداخلت نہیں ہے۔ میرے عقیدے سے لوگوں کو کیا کام ہے۔ یہ مدرستہ العلوم لوگوں کے لیے بنایا جاتا ہے۔ جس میں متعدد فرقے مسلمانوں کے شیعہ و سنی' وہابی و بدعتی داخل ہیں۔ اور یقینی ایک دوسرے کو بد عقیدہ سمجھتا ہے۔ پس جو شخص کہ اس مدرسے کے قیام میں کوشش کرے گا' وہ بلاشبہ ایسا ہی ہو گا کہ تین فرقے من جملہ چار فرقوں کے اس کو بدعقیدہ سمجھیں گے۔ اور ایسا کوئی شخص بھی پیدا نہ ہو سکے گا جس کو چاروں فرقے نیک عقیدہ سمجھیں۔ پس میں ان بزرگوں کے نزدیک' جو مجھے کافر بناتے ہیں' خواہ اور دس بیس مسلمانوں کے نزدیک بدعقیدہ سہی' مگر مدرستہ العلوم کا اس میں کیا نقصان ہے۔ ہر ایک فرقے کے لوگوں کو یہ بات دیکھنی چاہیے کہ جو مذہبی تعلیم اس میں ہونی قرار پائی ہے' وہ اس فرقے کے مذہب سے جس فرقے کے لیے وہ تعلیم ہے' موافق ہے یا مخالف۔

اے بزرگان پنجاب! میں آپ سے تمثلاً" ایک بات عرض کرتا ہوں۔ میں فرض کرتا ہوں کہ میں بد عقیدہ ہوں' مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو آپ اس کو اپنا خادم' اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کے لیے دولت سرا بنانے میں' جس میں آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں' آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں' چوہڑے' چمار' قلی' کافر' بت پرست' بد عقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو اس مدرستہ العلوم

کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کے مانند تصور کیجئے اور میری محنت و مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجئے۔ اور اس وجہ سے کہ بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ ایک بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً" بعد نسل ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو' اسی سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی اور اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔ اگر مجھ کو بدعقیدہ و کافر اور مرتد جانتے ہو اور میرے ہاتھ سے اس کام کا ہونا ناپسند کرتے ہو' بسم اللہ! میں علیحدہ ہونے پر تیار ہوں' کوئی دوسرا شخص کھڑا ہو اور اس تمام کام کو انجام دے' چشم ماروشن۔ مگر یہ بات کسی طرح پسندیدہ نہیں ہے کہ نہ آپ کریں اور جو کوئی دوسرا کرے تو اس کو کافر و مرتد بتلاویں۔ ہمت' جواں مردی اور قومی ہمدردی کی بات یہی ہے کہ قوم کی بھلائی کرو۔ اور اگر یہ دیکھتے ہو کہ مجھ سے قوم کو برائی پہنچنے والی ہے' فی الفور مجھ کو الگ کرو اور خود اس کام کے انجام کا بیڑا اٹھاؤ...

اے صاحبو! میں دن رات اس غم میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا کچھ بھروسا نہیں ہے۔ خصوصاً" مجھ سے آدمی جس نے بہت بڑا حصہ اپنی زندگی کا طے کر لیا ہے' اور اگر کچھ باقی ہے تو بہت قلیل باقی ہے۔ جب میرے کوچ کا وقت آن پہنچے گا تو کون شخص اس تمام کام کو اٹھاوے گا اور کون شخص اس کام کو انجام تک پہنچاوے گا۔ اگر خدا تعالیٰ کوئی ایسا شخص پیدا کرے کہ وہ میری زندگی ہی میں مجھ کو اس کام سے آزاد کر دے اور تمام بوجھ اپنے اوپر اٹھالے مجھ کو تو اس سے زیادہ خوشی اور خورمی کا کوئی وقت نہیں ہونے کا۔ مگر جب تک میری زندگی ہے' یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی قوم کو کوئیں میں گرتا دیکھوں اور چپکا بیٹھا رہوں۔

مدرستہ العلوم کی جائے قیام

یہ رپورٹ 26 اکتوبر 1872 کو علی گڑھ کے جلسہ میں سرسید نے سنائی۔ مرتب

جس قسم کا مدرستہ العلوم مقرر کرنا تجویز کیا گیا ہے اور جس سے یہ مقصد کہ طالب علموں کے اخلاق درست ہوں' اور ان کے خیالات پریشانی سے محفوظ رہیں' اور جمعیت اور تسکین کی طرف مائل ہوں' اور جذبات انسانی کو اعتدال پر لایا جاوے' اور حسن معاشرت ان میں پیدا ہو' اس قسم کے مدرسے کے لیے ضروری کہ وہ ایسے مقام پر مقرر کیا جاوے جو منجملہ شہرہائے کلاں کے نہ ہو' جہاں بہت سی ترغیبیں ان مقاصد کے برخلاف موجود ہوتی ہیں۔ اور نہ بہت چھوٹا گاؤں ہو جہاں اشیائے ضروری بھی بہ مشکل دستیاب ہوتی ہوں۔ یہ صفات مطلوبہ نہایت خوبی کے ساتھ علی گڑھ میں موجود ہیں۔

اس کے بعد ہم کو اس مقام کی آب و ہوا کی خوبی پر خیال کرنا بھی نہایت ضروری ہے جہاں مدرستہ العوم کا مقرر کرنا تجویز ہو' کیوں کہ ہمارے لڑکے وہاں رہیں گے' وہیں کی آب و ہوا سے پرورش پاویں گے' ان کی صحت و تندرستی اور نیز ان کے ذہن اور دل و دماغ کی قوت پر وہاں کی آب و ہوا کا بہت کچھ اثر ہوگا۔ علی گڑھ اپنی آب و ہوا کی خوبی میں مشہور و معروف ہے۔ اگر میں کہوں کہ تمام شمالی و مغربی اضلاع سے وہ آب و ہوا میں عمدہ ہے تو کچھ بے جا اور ناواجب نہ ہو گا۔ میں نے اس باب میں جناب ڈاکٹر جمس آر جیکسن صاحب بہادر ایم۔ ڈی سول سرجن علی گڑھ سے مشورہ کیا تھا' اور جو رائے کہ انھوں نے نسبت علی گڑھ کی آب و ہوا کی خوبی و عمدگی کے دی ہے' وہ میری اس رپورٹ کے ساتھ شامل ہے۔

مدرستہ العلوم کی تاریخ کے چند باب

سرسید احمد خاں نے مدرستہ العلوم کی تاریخ کے بارے میں نہایت مفصل تقریریں کیں اور مضامین لکھے

27 دسمبر 1889ء کی تقریر علی گڑھ کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ ان میں ربط کی کمی محسوس ہو سکتی ہے کیونکہ وہ واقعات شامل نہیں کیے گئے ہیں جن کی آج اہمیت نہیں

ہم نے وہی حصے شامل کیے گئے ہیں جن سے سرسید کی دردمندی متشکل ہو کر سامنے آسکے۔

مرتب

... لنڈن ہی میں میں نے اس مدرسے کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا' یہاں تک کہ جس نقشے پر آپ اس کالج کی عمارتوں کو بنتا ہوا دیکھتے ہیں' یہ بھی لندن ہی میں قرار پا چکا تھا۔ میں بد نصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا۔ میں سید محمود کا نہایت شکر گزار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں' جو مجھ کو حاصل ہوئیں' اس میں سید محمود نے میری بہت مدد کی۔ مجھ کو اس بات کے اقرار کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے لنڈن گیا تھا' میرا جانا فضول تھا۔

مدرسے کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقے کی' جس پر اس وقت مدرسہ چل رہا ہے اور جس پر آئندہ چلے گا' ان کی نسبت یہ کہنا کہ میں ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے والا تھا' ایک ناانصافی ہو گی۔ بلکہ صاف صاف کہنا چاہیے کہ اس کا بہت بڑا حصہ سید محمود کا تجویز کیا ہوا تھا جو انہوں نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح و گفتگو کرنے کے بعد قرار دیا تھا۔ سید محمود کا خیال تھا کہ کالج ایسا اعلیٰ درجے کا قائم ہو جس میں تمام یورپین علوم و فنون مع ان ایشیائی علوم کے' جو ہمارے بزرگوں کے لیے مایۂ فخر تھے' اعلیٰ درجے پر تعلیم ہو سکیں اور وہ

کالج محمڈن یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہو۔ ان کا خیال ہے کہ عربی فارسی لٹریچر مسلمانوں کا قومی تمغہ ہے' اس کو ہرگز چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اورینٹل ڈیپارٹمنٹ جو صرف انہی کی تجویز سے مدرسے میں قائم ہوا تھا' اس کے ٹوٹ جانے کا ان کو نہایت افسوس ہے۔ ہمیشہ وہ اس کا الزام مجھ پر دیتے ہیں کہ میں نے ان کی سرپرستی نہیں کی۔ مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔ ملک کی حالت ایسی ہے کہ وہ چل نہیں سکا۔ ان کا مصمم ارادہ ہے کہ وہ خود کسی وقت اس کو قائم کریں گے۔ خدا کرے کہ اس میں ان کو کامیابی ہو۔

جس وقت علی گڑھ میں مدرسہ کھولنے کا ارادہ ہوا' اسی وقت میں نے پنشن لینے کا قصد کیا اور بذریعہ صاحب جج ہائی کورٹ کو اطلاع دی کہ میرا ارادہ پنشن لینے کا ہے۔ اور اکو شٹ جنرل سے نقشہ طلب کیا اور درخواست کی کہ میری مدت ملازمت اور استحقاق پنشن کی تصدیق فرمادیں۔ جس قدر زمانہ اس کی تکمیل میں لگا' وہ لگا اور وسط 1876ء ع میں علی گڑھ میں آگیا۔ جو کہ سید محمود کا بھی ارادہ ہے کہ وہ کالج کی سرپرستی کے لیے علی گڑھ میں سکونت اختیار کریں گے' جس کا زمانہ کچھ بہت دور نہیں ہے۔ انہوں نے مجھ کو صلاح دی کہ آپ اپنی کوٹھی کو' جو علی گڑھ میں ہے' اور بہ سبب اخراجات سفرلنڈن رہن ہو گئی ہے' وہ چھوٹی ہے۔ اس کو فروخت کر کے زر رہن ادا کر دیجیے اور ایک دوسری کوٹھی جس میں میرے اور آپ کے دونوں کے رہنے کی گنجائش ہو' میں خرید لیتا ہوں۔ چنانچہ سید محمود نے یہ کوٹھی جس میں میں اب رہتا ہوں' خرید لی۔ میں نے اپنی کوٹھی مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے ہاتھ فروخت کر دی جس میں خدا کرے وہ آکر رہیں اور ترقی اور تکمیل مدرسہ میں کوشش کریں۔

بعد اس کے مدرسۂ ابتدائی کھولا گیا۔ تمام اخراجات مدرسہ جزو کل کالج فنڈ کمیٹی ادا کرتی رہی۔ 1875 ع کے چند مہینوں کی بابت 5866 روپے 7 آنے 9 پائی اس کمیٹی نے بنارس سے بھیجے اور اسی طرح اس وقت تک کہ ہیڈ کوارٹر کالج فنڈ کمیٹی کا علی گڑھ میں آیا تمام اخراجات مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر کے پاس بھیجتے رہے۔

اُس وقت طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہاؤس نہ تھا۔ طالب علم جس قدر تھے' چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھر دیے جاتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہوتی گئی۔ تعمیر کا کام جو میں نے شروع کر دیا تھا' اس میں بھی ترقی ہوتی گئی اور ارادہ ہوا کہ وائسرائے ارل نارتھ بروک کے ہاتھ سے رسم فونڈیشن ادا ہو۔ مگر ان کے دفعتاً" تشریف لے جانے سے وہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ لارڈ لٹن کے زمانے میں بعد دربار قیصری فونڈیشن کی رسم کا ان کے ہاتھ سے عمل میں آنا قرار پایا۔ آٹھویں جنوری 1877 ع کو حضور ممدوح علی گڑھ میں تشریف لائے اور

ایک نہایت پر تکلف جلسے میں رسم فونڈیشن ادا ہوئی...

اے صاحبو! مجھے اس بات کے کہنے سے شرم آتی ہے کہ یہ میری ہی محنت اور جاں فشانی اور تدبیر تھی جو آپ آج کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی اس قدر عالی شان عمارتیں بنی ہوئی دیکھتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ یورپ اور امریکہ کے سیاح بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ جو محنت و مشقت میں نے کی ہے اور جاڑے، گرمی برسات میں محنت اٹھائی ہے۔ قلی کا کام میں نے کیا ہے، اوورسیر کا کام میں نے کیا ہے، انجنیر کا کام میں نے کیا ہے۔ اپنا ذاتی روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اس کا صلہ ہمارے دوستوں نے اس پمفلٹ میں، جو خاص علی گڑھ میں چھاپ کر مشتہر کیا، یہ دیا ہے کہ تعمیر کا کام سیکرٹری اس لیے اپنے اختیار میں رکھتے ہیں کہ ان کو بھی نفع کثیر ہوا کرے جزاہ اللہ ثم جزاہ اللہ۔ مگر اے دوستو! میں ان باتوں سے رنجیدہ نہیں ہوتا۔ میری قوم نے مجھ کو اس سے بھی زیادہ سخت و سست کہا ہے۔ اگر قوم کی ایسی بدتر حالت نہ ہوتی تو ہم سب کو قومی بھلائی کی اس قدر فکر کیوں ہوتی۔ کبھی کبھی میں یہ کہہ اٹھتا ہوں کہ "ان اجری الا علی اللہ" مگر درحقیقت میں نے اپنی قوم کے لیے جو کچھ کیا ہے، اگر فی الواقعہ کیا ہو تو نہ بتوقع صلہ قوم کیا ہے اور نہ بامید اجر من اللہ۔

فاش میگویم و از گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

عزیزان علی گڑھ سے

1891ء میں سرسید کالج کے لیے فنڈ کی فراہمی کے لئے حیدر آباد دکن گئے۔ وہاں پچاس سے زیادہ علی گڑھ کے "اولڈ بوائے" مختلف اعلیٰ اور اچھے عہدوں پر کام کر رہے تھے۔ ان میں اردو کے اچھے ادیب اور مولوی عبدالحق کے دوست عزیز مرزا بھی تھے جنھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں کالج کے خلاف مضامین لکھے اور سرسید کو اتنا تنگ کیا کہ کالج سے نکال دیئے گئے۔

سرسید دکن گئے تو عزیز مرزا لرزاں، ترساں اور شرمندہ ان کے پاس آئے۔ آخر اچھی روایات کے امین خاندان کے فرد تھے۔ سرسید سے معافی مانگی اور سید عالی وقار نے سینہ سے لگایا۔

ان طلبہ نے سرسید کو ایک "اڈریس" پیش کیا جس میں یہ تجویز بھی تھی کہ سرسید کے یوم پیدائش کو فاؤنڈشن ڈے (Founder's Day) اور کالج ڈے مقرر کیا جائے۔ سرسید نے اس کی مخالفت کی اور کالج کے یوم تاسیس کو کالج ڈے قرار دیا۔

سرسید نے سپاس نامہ کا جو جواب دیا وہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مرتب

عزیزی عزیز مرزا و دیگر پیارے عزیزو!

حیدر آباد (دکن) میں بہت سی دلکش چیزیں اور بہت سے خوش نما مکانات اور بہت سے پر فضا گلزار ہیں، لیکن میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ کو سب سے زیادہ ان پھولوں کے دیکھنے سے خوشی ہوئی ہے جو ہمارے کالج کے یہاں اس وقت کھل رہے ہیں۔ یہ پھول میری زندگی کی بہار ہیں، یہی میری گل و لالہ ہیں اور یہی میری زندگی کی امیدیں ہیں۔ اور جب میں ان کو

سرزمین حیدر آباد میں سرسبز و شاداب دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو نہایت ہی خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ اس وقت جس قدر طلباء مدرستہ العلوم مسلمانان' علی گڑھ کے یہاں جمع ہیں' میں انہیں دیکھ کر بڑا خوش ہو رہا ہوں' اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور دلی خوشی سے تم سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی کی دعا مانگتا ہوں۔

اے میرے عزیزو! تم جانتے ہو کہ مجھے تم سے تمہارے حقیقی باپوں سے بھی زیادہ محبت ہے۔ میں تم سب کی دینی اور دنیوی ترقی کے لیے خدا کے حضور دعا مانگتا ہوں۔ جب میں تم میں سے ان کو دیکھتا ہوں جو اپنی زندگی میں کامیاب ہیں تو میرے دل کو نہایت درجہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور جو اپنے خیال کے مطابق ابھی کامیاب نہیں ہوئے' ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔ لیکن اے عزیزو! تم کو سمجھنا چاہیے کہ جو تعلیم تم کو دی گئی ہے' اس کا اصلی مقصد کیا تھا؟ اس کا اصلی مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ دولت حاصل ہو' بلکہ تمہاری اندرونی اور دلی اور دماغی ترقی مقصود اصلی تھا۔ تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ ایک شخص ہے جو نرا جاہل ہے اور ایک حرف بھی نہیں جانتا لیکن خدا نے اتفاقیہ اسے بے انتہا دولت دے رکھی ہے۔ لیکن مجھ کو امید ہے کہ تم ایسی دولت کی بہت زیادہ پروانہ کرو گے۔ سنو! اور غور سے سنو! تم اپنے دل و دماغ کی دولت پر ناز کرو گے۔ مجھ کو نہایت خوشی اس بات کو دیکھ کر ہوئی کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے اور اپنے عزیز کالج سے پوری محبت رکھتے ہو۔ اگرچہ تم مجھ سے ایسی محبت نہیں کر سکتے جیسی میں تم سے رکھتا ہوں۔ اگر تم سب اپنی محبت کو ایک جگہ جمع کرو' تو بھی وہ مجموعی محبت میری محبت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ مجھ کو امید ہے کہ تم اور بھی زیادہ ایک دوسرے سے اور اپنے کالج سے محبت کرو گے جس طرح کہ میں نے تم سے کی ہے۔ حقیقت میں کالج تمہاری ماں ہے' اور اگر تم مجھ کو اجازت دو اور معاف کرو تو میں کہوں گا کہ تم سب میرے بچے ہو۔ یہ امر جو تم نے قرار دیا ہے کہ جتنے طالب علم ایک جا ہوں وہ مدرسے کی سالگرہ کا جشن کریں' یہ نہایت خوشی اور زندہ دلی کی بات ہے' اور یہ امر بھی تمہارے دلوں میں تمہارے کالج کی محبت تازہ رکھنے کا ایک ذریعہ ہو گا۔ اس کے انجام دینے میں کچھ مشکل نہیں۔ اگر دو طالب علم یا چار طالب علم بھی معین تاریخ پر اس رسم کو منانے کے لیے ایک جگہ جمع ہوں اور آپس میں بیٹھ کر ذکر کریں کہ انہوں نے مدرسے میں کس کس طرح زندگی بسر کی' کیا کیا دیکھا اور کس کس چیز کا ان کے دل میں پر اثر باقی ہے تو مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

مجھ سے بھی لوگوں نے کہا تھا کہ کالج کے سالانہ جلسے کی تاریخ مقرر ہو۔ اس تاریخ کے مقرر کرنے میں بہت اختلاف رہا کیونکہ وہ فاونڈرز ڈے کی تاریخ مقرر کرنا چاہتے تھے' لیکن میں تم کو

یاد دلاتا ہوں کہ 7 - جنوری 1877ء وہ تاریخ ہے کہ کالج کی بنیاد کا پتھر لارڈ لٹن نے اپنے ہاتھ سے رکھا تھا۔ اور نہایت عمدہ بات یہ ہے کہ 7 جنوری کالج کے سالانہ جلسے کی تاریخ مقرر ہو اور فاؤنڈیشن ڈے کہلائی جائے۔ میں انشاء اللہ علی گڑھ جا کر خود اس کا بندوبست کروں گا۔

میں آخر میں تمہارے ایڈریس کا، جس میں وہ محبت پائی جاتی ہے جس کی مجھے تمہاری ذات سے امید تھی، شکریہ ادا کرتا ہوں اور تمہاری دینی و دنیوی کامیابی کی تم کو دعا دیتا ہوں۔

درس کتاب زندگی

سرسید نے علی گڑھ کے طلبہ کے لئے "ٹرکش لباس" مقرر کیا۔ ترکی آزاد مسلم ملک تھا اور سرسید کو اس پر فخر تھا۔ یہ بات انگریز پروفیسروں اور انگریز افسروں کو پسند نہ آئی کہ یہ لباس ان کے لباس سے ملتا جلتا تھا۔ "ہمارے غلام ہمارے لباس کی نقل کریں؟"

کالج کے پرنسپل مسٹر بک نے طلبہ کی ڈرل اور فوجی تربیت کے لئے رنگین اور مضحکہ خیز ریشمی لباس مقرر کیا۔ یہ صورت حال طلبہ کے لیے سخت ناگوار تھی۔ اس عہد کے طالب علم مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے پوری بات سرسید کو بتائی۔ سید صاحب کو بہت غصہ آیا۔ 7 دسمبر 1894ء کو جمعہ کا دن تھا۔ سرسید نے نماز جمعہ کے بعد اسٹریچی ہال میں طلبہ کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ سید صاحب داخل ہوئے۔ اسٹیج پر ایک کرسی سید صاحب کے لئے رکھی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ دوسری کرسی بھی لائی جائے۔ پھر بک صاحب کو بلا کر اس کرسی پر بٹھایا اور تقریر شروع کر دی

مرتب

اے عزیز طالب علمو!

مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں، تمہارے ماں باپ، تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہو گی کہ تم دور دراز فاصلے اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لیے جمع ہو۔ مختلف علوم کو پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ معقولات اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد گو کہ وہ تمہارے ملک اور تمہاری

قوم کے نہیں ہیں مگر تمہاری خوش قسمتی سے وہ تمہارے ساتھ پدرانہ محبت اور شفقت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے' جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں' سبق دیتے ہیں۔ مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے' نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے' نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے' بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پرکار اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اس کے پڑھنے کے لیے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں' وہ تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کو تو اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے کہ اس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اس کے معنی کیونکر سمجھو۔

اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف یا نئی زندگی" - یہی اصلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اس کالج کا ہے۔

تم اپنی زندگی کے پچھلے زمانوں پر غور کرو اور سمجھو کہ ہر ایک زمانہ تمہاری زندگی میں ایک نئی زندگی کا زمانہ گزرا ہے۔ جب تم بچے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے' تمہاری مائیں اپنی مادرانہ محبت سے تمہاری پرورش کرتی تھیں' اگر وہ نہ کرتیں تو تمہارا زندہ رہنا محال تھا۔

چند سال بعد تمہاری زندگی میں ایک دوسرا زمانہ آیا' جب کہ تم خود چلنے پھرنے اور اپنے آپ کھانے پینے لگے۔ یہ زندگی پہلی زندگی سے مختلف زندگی تھی۔ مگر تمہاری اس زندگی میں اور حیوانوں کی زندگی میں کم فرق تھا۔ یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گزر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے' جس میں تعلیم کی اور مذہبی باتیں سکھانے کی اور ان باتوں کی تعلیم کی ضرورت تھی جو تمہاری آئندہ زندگی کے لیے ضرور تھیں۔

یہ زمانہ بھی چند سال میں گزر گیا اور تم ایک اور نئی زندگی میں آئے جو خطرات سے خالی نہ تھی۔ اس زندگی میں تم ایسے آرام سے نہ تھے جیسے کہ پہلی زندگیوں میں تھے' کیوں کہ تم ہی میں بہت سے دشمن تمہارے پیدا ہو گئے تھے اور ہر وقت تمہاری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ تمہاری آنکھوں پر انہوں نے ایک قسم کا پردہ ڈال دیا تھا کہ تم کو نیک و بد کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ تمہارے ماں باپ نے' جہاں تک ان سے ہو سکا' تم کو دشمنوں سے بچایا۔ کوئی بچ گیا' کوئی کسی قدر بچا اور کسی قدر دشمنوں کے پنجے میں پھنسا اور کوئی دشمنوں کے جال میں ایسا پھنسا جس

کا اس سے نکلنا ناممکن ہوا...

یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گزر گیا مگر اس درمیان میں تم اپنے دشمنوں سے واقف ہو گئے اور ان سے پناہ میں رہنے کے لیے تم نے ایک نہایت زبردست اور عاقل ماں تلاش کی اور اپنے آپ کو اس کی حفاظت میں سپرد کیا اور ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے۔ تم سمجھے کہ تمہاری وہ عاقل ماں ہے کون؟ یہ کالج ہے جس میں تم داخل ہو اور اب تم سب اس کے بچے ہو۔

تم سمجھے کہ وہ تمہاری نئی زندگی کیا ہے؟ وہ کالج لائف ہے۔ اگر تم نے اس کو اچھی طرح گزارا تو تمہارا بیڑا پار ہے ورنہ منجدھار میں ڈوبتا ہے جس کے بعد پھر ابھرنا اور ترنا نہیں۔ اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اپنا بیڑا پار لگاؤ چاہے منجدھار میں ڈبوؤ۔

اے عزیزو! کالج لائف کا اطلاق ان طالب علموں پر صادق نہیں آتا جو ڈے اسکالر ہیں بلکہ ان پر صادق آتا ہے جو دن رات اپنی عاقل ماں کے ساتھ یعنی کالج کے احاطے میں رہتے ہیں اور بورڈر کہلاتے ہیں۔ پس میرے مخاطب وہی عزیز طالب علم ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اس عاقل ماں کی گود میں ڈالا اور اس کالج کے احاطے میں رہتے ہیں۔

اب مجھ کو بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیونکر فائدہ اٹھانا اور اس کو کیونکر گزارنا چاہیے۔

سب سے اول اور تمام برکتوں کی جڑھ تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم، ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے، پورب ہوں یا پچھم کے، اتر کے ہوں یا دکھن کے، جب وہ سب تمہاری اس عاقل ماں کی گو میں پڑے ہیں، تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرنہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو توڑ دیا، اور جس طرح ایمان کے لیے کلمہ توحید پہلا رکن ایمان کا ہے، اسی طرح وحدت پہلا رکن بورڈنگ ہوس کی فائدہ مندی کے لیے ہے۔ اور جس طرح ایمان کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی ایمان کے لائق نہیں رہتا، اسی طرح بورڈنگ ہوس کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی بورڈنگ ہوس کے قابل نہیں رہتا۔ اس لیے تم کو لازم ہے کہ مثل ماں جائے بھائی کے آپس میں محبت اور دوستی برتو....

تمہارا کھانا پینا، رہنا سہنا، آپس میں ہر وقت ملنا، سوسائٹی میں شریک رہنا، کھیلوں کو آپس میں مل کر کھیلنا، لٹریری جلسوں میں شریک رہنا، یہ باتیں اس لیے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی، ایک دوسرے کی ہمدردی پیدا ہو، جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے۔

تمام چیزیں جو دنیا میں عقلی و ذہنی ہیں، ان کا کچھ نہ کچھ نشان ظاہر میں بھی پایا جاتا ہے۔ تم

جانتے ہو کہ اس برادری اور محبت اور دوستی کا، جو تم آپس میں اپنی عاقل ماں کے بچے ہونے میں رکھتے ہو، ظاہری نشان کیا ہے؟ یہ نشان کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے، خدا کا بنایا ہوا ہے۔ جس کے پورا نہ کرنے سے تم صرف دنیا ہی میں ملامت کے قابل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی ناراضی کے بھی مستحق ہوتے ہو۔ وہ نشان کیا ہے؟ جماعت کی نماز ہے جو خدا نے، جیسا کہ وہ واحد ہے، تمہاری آپس کی وحدت کے لیے مقرر کیا ہے۔

جب تم سب نماز کے لیے ایک جگہ جمع ہو گے اور جماعت سے نماز پڑھو گے تو علاوہ اس کے کہ تم خدا کا فرض ادا کرو گے، اس دلی یگانگت کو جو تم آپس میں رکھتے ہو گے، عملی طور پر بھی پورا کرو گے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ شیعہ اور سنیوں نے اپنی اپنی نادانی سے خدا کا فرض ادا کرنے میں بھی تفرقہ ڈالا ہے۔ میں اس کو مٹانا نہیں چاہتا کیوں کہ وہ بجز خدا کے مٹائے مٹ نہیں سکتا، مگر میں شیعہ طالب علموں کو بھی یہ ضرور کہوں گا کہ نماز کے وقت وہ بھی مسجد میں موجود رہیں، جس سے اسلام کی شان اور ایک خدا کے پوجنے والوں کی کثرت ظاہر ہو......

اس وحدت کے قائم کرنے کو شیعہ و سنی دونوں کے لیے ایک مسجد بنائی گئی ہے، اور شاید تمام ہندوستان میں آپس میں شیعہ اور سنیوں کے اتحاد کی یہ ایک ہی مثال ہے۔ پس اے میرے عزیز شیعہ طالب علمو اور میرے عزیز سنی طالب علمو! تم اس وحدت کو قائم رکھو اور جہاں تک ہو تفرقے کو مٹاؤ کہ اس وحدت کا قائم رکھنا تمہارے دین و دنیا دونوں کی بہبودی کا باعث ہے۔

ایک اور چیز اس وحدت اور آپس میں یگانگت پیدا کرنے کی ہے۔ وہ کیا ہے؟ تم سب بورڈوں کا اور خصوصاً" کالج کلاس کے طالب علموں کا ایک سا لباس ہونا۔ شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ ظاہری چیزوں کو اندرونی جذبات کی اصلاح سے کیا تعلق ہے۔ مگر یہ محض غلطی ہے۔ مذہب کی رو سے دنیا کے برتاؤ کی رو سے بہت سے ظاہری چیزیں ایسی ہیں جو اندرونی جذبات پر اثر کرتی ہیں۔ دو شخص جو آپس میں ملتے ہیں اور معین اشاروں سے ایک دوسرے کو مطلع کرتے ہیں کہ وہ فری میسن ہیں، شاید تم کو معلوم نہ ہو گا مگر اس امر کے جاننے کے بعد جو جوش محبت و یگانگت ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، وہ دوسرے کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا ایک سا لباس ہونا اس سے زیادہ اندرونی جذبات کی اصلاح کا ہمیشہ محرک ہو گا۔

بڑے بڑے مہذب لوگوں کے کالجوں میں ایک قسم کا متحد لباس طالب علموں کے لیے مقرر ہے۔ ان کالجوں کو جانے دو، تم اپنے مذہب کے بعض مشائخوں کے خاندانوں مثل صابری اور آبلوانی، ناصری وغیرہ کو دیکھو کہ انہوں نے اسی یک جہتی قائم کرنے کے لیے اپنے مریدوں کے

لیے ایک قسم کا لباس یا نشان مقرر کیا تھا۔

جو لباس اب تمہارا ہے یعنی ٹرکش ٹوپی اور کوٹ اور انگلش بوٹ یہ نہایت عمدہ ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ تمہارے کوٹ مختلف رنگ کے ہیں۔ پس سب کو ایک وضع اور ایک رنگ کے کوٹ اختیار کرنے چاہئیں۔

سلطان ٹرکی کے دربار میں بھی تمام امراء اور نوکر چاکر لال ٹوپی اور بوٹ پہن کر ہیں۔ ہماری انگلش گورنمنٹ نے بھی اسی ضرورت پر خیال کر کے اپنے درباروں میں انگلش بوٹ پہنے آنے کی اجازت دی ہے۔ ہندوستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم بین انگریز' جو ہندوستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' ایسے ہیں جو ٹوپی کوٹ اور بوٹ پہننے پر اعتراض کرتے ہیں' مگر تمام اعلیٰ حکام اور عالی خاندان انگریز اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا مودبانہ فل ڈریس ہے جو انہوں نے اختیار کیا ہے۔ مگر تم کو اپنے بوٹوں کو نہایت صاف اور پاکیزہ رکھنا چاہیے کیوں کہ وہ تمہارے لباس میں داخل ہیں۔

جو انگریز ان باتوں سے چڑتے ہیں اور ہمارے اس لباس سے بھڑکتے ہیں' میرے خیال میں وہ اس بات کے بڑے خواہش مند ہیں کہ کبھی ہندوستانیوں اور انگریزوں میں دوستی و محبت اور اخلاص کا برتاؤ نہ ہو۔ باوجود ان کوششوں کے' جو میں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد اور دوستی پیدا کرنے کی کی ہیں' ایسے انگریز سے جو ان باتوں میں کاوش کرتا ہے' میں خود کبھی اس سے نہیں ملتا اور دوستی کرنا نہیں چاہتا...

اے عزیزو! اب مجھے تم کو ایک اور بات بتانی باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس عاقل ماں کی گود میں تم پڑے ہو اس میں جو سب سے اعلیٰ چیز ہے وہ اس کی روح ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ روح کیا ہے۔ وہ روح وہ استاد ہیں جو تم کو تعلیم دیتے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ ان کا حد سے زیادہ ادب اور ان کی فرماں برداری کرو۔ ہم مسلمانوں میں استاد اور باپ کا درجہ ادب اور فرماں برداری میں برابر ہے۔

یہ شکایت سننے میں آئی ہے کہ انگریزی خواں طالب علم اپنے استادوں اور اپنے ماں باپوں کا ادب نہیں کرتے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ تم میں ایسا کوئی نہیں ہے' مگر جو انگریزی خواں طالب علم ایسا کرتے ہیں وہ دنیا اور خدا کی لعنت کے مستحق ہیں۔ ماں باپ ان کا جسم پیدا کرنے والے ہیں' اور استاد ان میں انسانیت ڈالتے ہیں اور اس لیے استادوں کا درجہ حقیقت میں ماں باپ سے بھی زیادہ ہے۔ جب خدا نے ماں باپ کی نسبت فرمایا ہے کہ "لا تقل لهما اف ولا تنهر هما وقل لهما قولا كريما" تو اسی پر قیاس کر لو کہ تم کو استادوں کا کس قدر ادب کرنا واجب ہے۔

میرے عزیزو ____ میرے آسمان کے تارو

30 دسمبر 1888ء کو سرسید نے لاہور کے مسلمان طلبہ سے کہا

مرتب

اے میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا دیکھوں۔ ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی پھیلے کہ سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے آگے ماند ہو جاویں۔ خدا سے امید ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ اے خدا! ایسا ہی کر! اے خدا ایسا ہی کر! آمین!

اے میرے عزیزو! جب کہ تم نے ابھی ابھی اسی مقام پر میری زبان سے یہ بات سنی کہ میری قوم کے بچے ایسے ہوں اور میری قوم کے بچے ویسے ہوں تو آپ سمجھے ہوں گے کہ میری قوم سے میری میراد کیا ہے؟ غالباً" آپ اس سے صرف سید تو نہ سمجھے ہوں گے بلکہ آپ ضرور سمجھے ہوں گے کہ میری مراد اس سے کل مسلمان ہیں۔ پس تم کو یقین کرنا چاہیے کہ اگر تم آسمان کے تارے ہو جاؤ اور ہماری قوم میں نہ رہو تو جو تعلق یا رشتہ میں نے جوڑا ہے وہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو گناہ نہ کرتا ہو۔ سب لوگ اس شہنشاہ وحدہٗ لاشریک کے آگے گنہ گار ہیں۔ لیکن ایک وسیلہ ہے جس سے ہم نجات پاویں گے اور وہی وسیلہ ایک رسی ہے، جس سے اگر ہم سب بندھے رہیں تو ایک قوم بھی ہوں گے۔ وہ کیا ہے؟ خدا اور خدا کے رسول محمد رسول ﷺ پر ایمان لانا اور فرائض کو ادا کرنا۔ پس میں چاہتا ہوں کہ تمام میرے بچے طالب علم جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لیے میری آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں او تمام دنیا میں اعلیٰ شمار کیے جاویں، ان دو لفظوں "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کو نہ بھولیں۔

اے میرے دوستو! جو چیز اندرونی ہوتی ہے اس کے لیے کوئی نہ کوئی بیرونی نشانی بھی ہوتی ہے۔ کسی فوج میں کسی سپاہی کا داخل ہونا ایک اندرونی بات ہے مگر اس کے لیے ایک خاص وردی کا معین ہونا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس فوج کا سپاہی ہے، بیرونی نشانی ہے۔ اس

طرح مسلمان ہونے کے لیے خدا و خدا کے رسول (ﷺ) پر دلی اعتقاد رکھنا' جس کو خدا ہی جانتا ہے' اندرونی بات ہے' مگر اس کی ظاہری وردی ہمارے لیے خدا کی عبادت کے لیے پانچوں وقت حاضری دینا ہے' جس سے میری مراد نماز پنج گانہ ہے۔ اے میرے دوستو! اگر تم نماز چھوڑ دو گے تو میں افسوس سے کہتا ہوں کہ اس وردی کو اتار پھینکو گے اور خدا کی فوج میں یا ہماری قوم میں شامل نہ رہو گے۔ ہر ایک رجمنٹ' ہر ایک پلٹن کا کچھ نہ کچھ نشان ہوتا ہے۔ کسی کے ہاتھ پر' کسی کی بانہہ پر' کسی کے کندھے پر۔ ہماری رجمنٹ یا خدائی پلٹن کا نشان ہمارے ماتھے پر ہے' جب کہ وہ خدا کی عظمت کے آگے زمین پر ٹکا ہوا ہو

تمام اخلاق اور صفات انسانی کا مجموعہ اور تمام لب لباب خدا کی مخلوق کے پیدا ہونے کے مقصد کا ان پانچ حرفوں میں ہے جس کو ہم "اسلام" کہتے ہیں۔ جب اس کی تفصیل پوچھو تو یقین کرو گے کہ در حقیقت وہ انسان کی صفات اندرونی و بیرونی کے مجموعے کا نام ہے۔ پس ہم کو اس نام کا ادب کرنا اور جہاں تک ہو سکے' اپنے آپ کو اس نام کا مصداق بنانا لازم ہے۔ مجھے نہایت افسوس اور رنج ہوتا ہے جب کہ میں یہ دیکھتا یا سنتا ہوں کہ ہماری قوم کے بعض لڑکے (معاف کرنا میں خاص کسی کو مخاطب کر کے نہیں کہتا ہوں) جو انگریزی پڑھنا شروع کرتے ہیں' ان کا پورا پورا ادب نہیں کرتے۔ جو سوشل اور اخلاقی صفات یورپین میں ہیں' وہ ہی نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اگر ہم صدیوں تک کوشش کریں تو شاید وہاں تک پہنچیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے نوجوان ان کی خوبیوں کا تو دھیان تک نہیں کرتے اور ان میں جو عیب ہوتے ہیں ان کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر ان کی کوئی اچھی بات بھی اختیار کرتے ہیں تو ایسی بری طرح پر کہ وہ خوبی بھی عیب ہو جاتی ہے: ع

ہرچہ گیرد علتی علت شود

چنانچہ انہوں نے آزادی کا ایک لفظ سیکھ لیا ہے۔ یہ لفظ تو انہوں نے کلن میں ڈال لیا مگر اس کی خوبی کو نہیں سمجھا اور اس سبب سے نہایت بد طریقے میں اس کا استعمال کیا۔ بزرگوں سے بے پروائی سے پیش آنے لگے۔ ماں باپ کا ادب جیسا چاہیے اس قدر بجالانا چھوڑ دیا۔ اپنے سے عمر میں جو بڑا ہے' اس کا اور اپنے بزرگوں کے دوستوں کا لحاظ ترک کر دیا۔ یہ تمام باتیں نہایت رنج دہ ہیں اور جس قومی ترقی کا میں خواہش مند ہوں' اس کو روکنے والی اور برباد کرنے والی ہیں۔ پس میں اپنی قوم کے بچوں سے التجا کرتا ہوں کہ جس قدر وہ یورپین سینسز و لٹریچر میں ترقی کرتے جاویں اسی قدر اخلاق حمیدہ اور بزرگوں کے ادب میں بھی ترقی کریں۔

قومی تماشا

(سرسید پینی ریڈنگ. تھیٹر)

6 فروری 1890ء کو علی گڑھ کی نمائش کے موقع پر دنیا نے قومی تماشا دیکھا۔ اس تماشا سے پہلے اشتہارات تقسیم ہوئے

"سرسید تھیٹر اور ممتاز اصحاب کا ایکٹنگ"

پہلے سین میں پردہ اٹھا تو ایک کپتان کمر سے تلوار لٹکائے اور ترکی لباس میں ملبوس نظر آیا۔ اور کالج کے بارہ طلبہ سپاہیوں کی وردی میں اسٹیج پر فوجی گشت کر رہے تھے۔ پردہ گر گیا اور دوسرے سین میں ایک بزرگ اسٹیج پر آئے۔ کپتان نے پوچھا "کون؟"۔ جواب نہ ملا تو کپتان ان بزرگ کی طرف بڑھا۔ بزرگ خالص عربی لباس میں ملبوس تھے اور ان کے سینے پر مدرستہ العلوم کا تمغہ چمک رہا تھا

کپتان نے استقبال کیا اور سرسید سے کہا۔ "آئیے اور اپنا پارٹ ادا کیجیے"۔

اس پر سرسید نے تقریر کی اور حافظ کی ایک غزل سنائی۔ اس غزل کے آخر میں دو شعر سرسید کا اضافہ ہیں اور انہیں کے ہیں۔

اس تھیٹر میں کالج کے پروفیسروں اور علی گڑھ تحریک کے رہنماؤں نے بھی اپنا اپنا پارٹ ادا کیا۔

مرتب

لیڈیز اینڈ جنٹلمین

کون ہے جو آج مجھ کو اس اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں اپنی قوم کا درد نہیں ہے، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو ان

باتوں کو، جن سے انسان کو شرم اور حیا اور غیرت ہونی چاہیے، اپنی شیخی اور اپنے افتخار کا باعث سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو قوم انسان کی بھلائی کے کاموں کو، جو نیک نیتی سے نیکی کے لیے کیے جاویں، بے عزتی کا کام سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو خدا کو دھوکا دینے کے لیے مکر یا پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچے۔ آہ اس پر جو قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جس سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جاوے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و نفرین کا کام سمجھے۔

اے رئیسو! اور دولت مندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کیسی ہی بد حالت میں ہو، ہمارے بچوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا بھی خیال تھا جو تم سے پہلے تھے، مگر اب انہی کے بچوں کی وہ نوبت ہے جن کے لیے آج ہم اس اسٹیج پر کھڑے ہیں۔

اے صاحبان! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم مفلس ہو گئی ہے، قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل و رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں اعانت پہنچے مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، بہت ہی قلیل ملی۔ والنٹیر بنانے چاہے، بہت کم بنے اور جو بنے ان سے بھی کچھ بن نہ آئی۔ پس آج میں اس اسٹیج پر اس لئے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔

لیڈیز اور یورپین جنٹلمین - میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے اپنی قوم کے غریب بچوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ بڑے بڑے ڈیوک ڈیوچس اسٹیج پر آئے ہیں اور غریبوں کی امداد کرنے سے عزت پائی ہے۔ اس وقت بھی یورپین نے اپنی نیک دلی ثابت کی ہے کہ باوجود ہم قوم نہ ہونے کے ہمارے شریک ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں ہمارے یورپین دوست اور مسٹر کینڈی کلکٹر و افسر ضلع ہیں۔ نہیں نہیں مسٹر کینڈی میرے دوست۔ اس اسٹیج پر آنے والے ہیں۔ مگر ہندوستانیوں کا نہ وہ خیال ہے، نہ وہ دل اور نہ وہ دلی نیکی جو ایسے کاموں کے باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان میں پہلا موقع ہے جو میں اس قومی کام کے لیے اسٹیج پر کھڑا ہوا ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کروں گا اور ضرور کروں گا اور لوگوں کو جو وہ بکنا چاہیں بکنے دوں گا۔ کون سی بات ہے جو لوگوں نے میری نسبت نہیں کہی، اور میں نہایت خوش ہوں گا کہ جو کچھ ان کو کہنا باقی رہ گیا ہو وہ بھی اب کہہ لیں۔ اس موقع پر میں حافظ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ایک

غزل پڑھوں گا جو میرے فیلنگ کے مناسب ہے اور جس میں میں نے دو شعر اور ملا دیے ہیں۔
اس کے بعد نہایت جوش سے حافظ (رحمتہ اللہ علیہ) کی یہ غزل پڑھی:

ساقیا برخیز و در دہ جام را
خاک برسر کن غمِ ایام را

ساغرِ مے بر کفم نہ تاز سر
بر کشم ایں دلقِ ارزق فام را

گرچہ بدنامی است پیش عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

بادہ در دہ چند ازیں باد غرور
خاک بر سرِ نفسِ نافر جام را

محرمِ رازِ دلِ شیدائے خویش
کس نمی بینم ز خاص و عام را

با دل آرامے مرا خاطر خوش است
کز دلم یک بارہ برد آرام را

ننگرد دیگر بسرو اندر چمن
ہر کہ دید آں سروِ سیم اندام را

کیست آں سروِ سہی کاندر سرش
یافتم دین و دل و آرام را

قوم ما اے قوم ما کز بہر تو
دادہ ام برباد ننگ و نام را

صبر کن احمد بہ سختی روز و شب
آخرش روزے بیابی کام را

سرسید کی اس غزل سرائی کے بعد کچھ اور بھی گیت گائے گئے۔

سفرنامۂ لندن

مکتوبات کے پیرائے میں

سرسید یکم اپریل 1869ء کو بنارس سے انگلستان کے "کثیر القاصدی " سفر پر روانہ ہوئے۔ سفر کا مقصد حامد و محمود کی تعلیم کا بندوبست ہی نہیں تھا بلکہ وہ مسلم بچوں کی تعلیم کے لئے جیسا ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انگلستان کی درس گاہوں کو دیکھنا ضروری تھا۔ پھر یہ علمی سفر بھی تھا۔ خطبات احمدیہ کے لئے مواد حاصل کرنا ان کے پیش نظر تھا۔ اسی سفر میں انہوں نے حمایت اسلام کے سلسلہ میں کتابیں اپنے خرچ سے شائع کرائیں۔

سرسید نے وقتاً" فوقتاً" اپنے سفر کے حالات مکتوبات کی صورت میں سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار میں شائع کرنے کے لئے بھیجے۔ بعد میں یہ حالات تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ کئی اور بکھری ہوئی تحریروں کے ذریعہ اسمٰعیل پانی پتی نے "مسافران لندن" کو کتابی شکل دی۔

اس میں حیات جاوید کے اقتباسات اور محسن الملک کے نام سرسید کے خطوط کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔

اس سفرنامہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسید کی نظر زندگی کے ہر شعبے پر تھی۔ وہ سوچنے والا ذہن، محسوس کرنے والا دل اور کھلی آنکھیں رکھتے تھے جو اشیاء کی حقیقت تک پہنچ جاتی تھیں۔

مرتب

ایک پارسی کی صاف و شستہ اردو

اسی جہاز میں فرام مہربان جی تھالتی والی پارسی سے ملاقات ہوئی۔ ایک جوان تخمیناً"

ستائیس اٹھائیس برس کی عمر کا ہے' پونا کا رہنے والا اور پوناہی کے مدرسے میں انگریزی اور گجراتی پڑھی ہے اور ڈاک خانہ عدن میں پچاس روپے ماہواری پر نوکر ہو کر جاتا ہے۔ انہوں نے مجھ سے نہایت صاف اور شستہ اردو میں بات چیت کی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ "پونا کے آدمی کی ایسی صاف اردو گفتگو کہاں سے آئی؟" اس نے کہا "گجراتی زبان میں بہت سے فارسی لفظ ہیں اور ذرا سے تغیر میں گجراتی اردو ہو جاتی ہے۔ میں اس کا خیال رکھتا تھا اور مجھے شوق تھا۔ میں اردو صاف بولنے لگا۔" یہ سن کر میں اور زیادہ متعجب ہوا اور میں نے کہا کہ "اردو نے گجرات کو بھی گھیر لیا ہے۔"

اردو اور گجراتی کا فرق

اب مجھے شوق ہوا کہ گجراتی زبان سنوں' چنانچہ میرے سامنے انہوں نے آہستہ آہستہ گجراتی بولی اور اردو میں ہر ایک لفظ کو سمجھایا۔ میں نے دیکھا کہ حقیقت میں اردو ہے' یا تو یوں کہو کہ بہت کم فرق ہے' یا یوں کہو کہ سوائے چند الفاظ کے صرف لہجے کا تفاوت ہے۔ میں نے چاہا کہ وہ کوئی مطلب گجراتی میں بیان کریں اور میں اس کو گجراتی زبان اور فارسی حرفوں میں معہ اردو ترجمے کے لکھوں۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس ایک کتاب ہے اس کی عبارت لکھ لو۔ چنانچہ علم عروض وقافیہ کی وہ ایک کتاب اٹھالائے جس کا نام سیت رتمش ہے اور اس کو تصنیف کیا ہے منچرجی شاپور جی نے۔ چند مقام اس کتاب کے مجھے سنائے۔ اس میں سے دو مقام کی عبارت میں نقل کرتا ہوں۔

دیباچہ

ای فرتی جھان ای مھر دانی

اے پھرتی دنیا اور اے منہ کی

جبان تی پاک خدا تعالی نی ھر دم یا و کرو اسارون

زبان اس پاک خدا تعالیٰ کی ہر دم یاد کرنے کے واسطے بندھی ہوئی ہے اور انسان کی عقل اس کے واسطے

بندھی ہوئی ہے اور انسان کی عقل اس کے واسطے

دریافت کروانی گرفتاری مان دیوانگی نی اثر بتلا دی چھے۔

دریافت کرنے کے گرفتاری میں دیوانگی کے اثر بتلا دی ہے۔

دوسرے مقامات کی عبارت

سخنو بی جاتنا چھے نثرانی نظم یہ بی
سخن دو قسم کی ہے نثراور نظم یہ دوذات

جاتنی عبارت مان سنخنو و اپرو امان اوی چھے بعجی
یعنی قسم عبارت میں سخن کہنے میں آتی ہے بعضے

دناؤ ناکیھا موجب عالم نی آنکھ نی روشنی
داناؤں کے کہے بموجب عالم کی آنکھ کو روشنی

بخشنارا سخن ناچھرہ نی بی جات نارنگ تھی
بخشنے والا سخن کے چہرے کو دو ذات یعنی قسم کے رنگ سے

دلکش انی دی پک دار کی دھا مان اوی چھے۔
دلکش اور دمک دار کرنے میں آتی ہے۔

گجراتی زبان میں صاحب سلامت کرنے میں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں:

صاحب مھربان	خوش تو چھو	طبیعت تو خوش چھے
صاحب مہربان	خوش تو ہو	طبیعت تو خوش ہے

اب غور کرنا چاہیے کہ یہ زبان اردو کے کس قدر قریب ہے اور کتنے فارسی بلکہ عربی لفظ اس میں شامل ہیں۔ ہر مقام پر مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ الہ آباد ایسوسی ایشن کس کس ملک اور کس کس زبان میں فارسی لفظ نکال کر قدیم بھاشا جاری کرے گی۔ حقیقت میں اردو موجودہ اب ہمارے ملک کی ورنیکلر ہے۔

میجر ہیسٹنگ فریزر صاحب متعلق حیدر آباد بھی اسی جہاز میں ہیں۔ شرفائے اسلام سے زیادہ صحبت رہی ہے۔ فارسی بخوبی بولتے ہیں بلکہ اردو سے فارسی میں بہت صاف و بامحاورہ گفتگو کرتے ہیں۔ کہتے تھے کہ کئی سال سے فارسی بولنے کا اتفاق نہیں ہوا' اس سبب سے اکثر الفاظ محاورہ سہو ہو گئے ہیں۔ نہایت مرد قابل واشراف دوست ہیں۔ انہوں نے نظام کی ایک تاریخ لکھی ہے جس کا نام ''آور فیتھ

فل الائی نظام" ہے۔ اس کتاب کے نام کا ترجمہ ہے "دوست صادق مانظام" ہمیشہ ہر روز مجھ سے پوچھتے کہ "سید صاحب! مزاج شما خوش است؟ باآرام ہستی، ہیچ تکلیف کہ نداری۔" حقیقت یہ ہے کہ ان صاحب سے مل کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ امید ہے کہ لندن میں پھر ملاقات ہوگی مگر یہ بات نہایت رنج کی ہے کہ ابھی قریب زمانے میں ان کی میم صاحبہ کا، جو ڈیوڈسن صاحب ریزیڈنٹ حیدر آباد کی بیٹی تھیں، انتقال ہوگیا اور کئی بچے صغیر السن چھوڑے ہیں۔ اسی سبب سے نہایت رنج و سراسیمگی کی حالت میں تین مہینے کی رخصت لے کر ولایت جاتے ہیں۔ اگر یہ رنج اور صدمہ ان پر نہ ہوتا تو غالباً" اور بھی زیادہ خوش مزاج و خوش اخلاق ملاقات و صحبت میں معلوم ہوتے۔

میجر اسمتھ صاحب غازی پور کے اسٹڈ والے اور ان کی میم صاحبہ اور ان کی بیٹی ایڈا جو تین چار برس کی ہے اور بہت تماشے کی باتیں کرتی ہے اور ایک ہندوستانی آیا اور مسٹر ٹیلر جو افیم کے کام پر مرزا پور میں متعین ہیں، اسی جہاز میں ہیں اور اس سبب سے کہ ہم اور وہ ایک ملک سے آئے تھے اور بسبب غازی پور اور بنارس رہنے کے نام سے شناسائی تھی، ایک قسم کی دوستانہ صاحب سلامت ہوگئی اور ایڈا بہت آتی ہے اور تماشے کی باتیں کرتی ہے اور میم صاحبہ بھی نہایت مہربانی سے بات چیت اور صاحب سلامت کرتی ہیں۔

جہاز میں ڈاڈ صاحب کی نامناسب گفتگو

جس دن "پونا" دخانی جہاز روانہ ہوا اسی دن کھانے کے بعد میجر ڈاڈ صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب یورپ آپہنچے۔ میں نے ادب آمیز اخلاق سے اس کو تسلیم کیا اور بشاشت کے ساتھ یہ بات کہی کہ ہاں آج ہماری پہلی منزل یورپ کے ملک میں ہے۔

ڈاڈ صاحب۔ کہا کہ "ہاں اب پیغمبر ﷺ کا ملک چھوٹا اور کافروں کا ملک آیا۔" اگرچہ اس میں انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس میں ہم کچھ برا مانتے اور جو سخت یا نامناسب لفظ انہوں نے کہا وہ اپنی یا اپنی قوم کی نسبت کہا مگر ان کا یہ طرز کلام مجھ کو نہایت ناپسند آیا اور طبیعت کو بہت ناگوار گذرا اور میں نے خیال کیا کہ ایسی لے (طرز) میں گفتگو کرنا کیسا اخلاق اور تہذیب کے برخلاف ہے، اور ایسے عمدہ اور متین اور حلیم ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کی زبان سے اس طرز پر کیوں گفتگو ہوئی؟ خیر میں نے چند دم توقف کرکے کہا کہ "یوں نہ کہیے بلکہ یوں کہیے کہ اہل کتاب کا ملک آیا" مگر کئی گھنٹے تک مجھ کو بڑا خیال رہا اور سوچتا رہا کہ ان کی طینت اور طبیعت کس قسم کی ہے۔ مگر آخر کو میں نے خیال کیا کہ غالباً" ان کی یہ گفتگو کسی قسم کے تعصب کی راہ سے نہ تھی، اتفاقیہ سہل طور پر ان کی زبان سے نکل گیا اور جو کبیدگی میرے دل

میں آئی تھی اس کو میں نے نکال دیا۔

ایک باہمت مسلمان آیا

مسماۃ نصیبا" آیا' مسز کوپر ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کے ساتھ اسی جہاز میں ہے۔ وہ بھی نہر سویز سے کچھ کم عجب نہیں۔ یہ آیا کانپور کی رہنے والی ہے' قوم پٹھان مسلمان ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس کو یورپ میں آتے ہوئے اکیسویں دفعہ ہے۔ ہمیشہ انگریزوں اور ان کے بچوں کو ٹھیکہ پر ولایت پہنچانے آتی ہے اور پہنچا کر چلی جاتی ہے۔ انگریزی بخوبی بولتی ہے۔ انگلینڈ' اسکاٹ لینڈ' آئرلینڈ' فرانس' پورچوگل' لزبن اور اور مقامات یورپ کے اس نے دیکھے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ شاباش تو تو مردوں سے بھی اچھی ہے۔

ایک دفعہ میں اس سے کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا' ہمارے شفیق دوست میجر ڈاڈ صاحب بہادر بھی وہاں آ کھڑے ہوئے۔ میں نے آیا سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ اس نے کہا محمدن یعنی مسلمان۔ میجر ڈاڈ صاحب نے یا تو دل لگی سے یہ طنز سے مجھ سے کہا کہ "تمہاری قوم؟" میں نے نہایت خوشی اور صدق دلی سے کہا کہ "ہاں بے شک ہماری قوم' ہماری قوم' بلاشبہ تمام انسان ہمارے نسلی بھائی ہیں اس لیے کہ ایک باپ سے پیدا ہوئے اور سب مسلمان ہمارے مذہبی بھائی ہیں جو ایک خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔"

لندن میں سرسید کے رہنے کا مکان

اب میں ایک نہایت دلچسپ مکان میں رہتا ہوں (یہاں کے مکانات اور ان کے موقعوں کا حال پھر لکھوں گا)۔ چھ کمرے اس مکان کے ہم سے متعلق ہیں: چار تو بیڈ روم ہیں یعنی ہم چاروں کے لیے سونے کے چار کمرے' حامد' محمود' مرزا خداداد بیگ کے سونے کے کمرے میرے سونے کے کمرے سے کسی قدر زیادہ اچھے ہیں اور ان میں فرنیچر بھی کسی قدر زیادہ ہے' اس لیے کہ وہ اسی کمرے میں رات کو پڑھتے بھی ہیں اور کتاب بھی دیکھتے ہیں۔ میرے کمرے میں صرف سونے کا سامان ہے مگر ایسا ہے کہ میں نے ہندوستان میں نہیں دیکھا تھا' شاید کلکتہ و بمبئی والوں نے دیکھا ہو۔ ایک کمرہ میرے لکھنے اور کتاب دیکھنے اور کتاب کے تصنیف کرنے کا ہے اور اسی کمرے میں ہم کھانا بھی کھاتے ہیں اور چاء بھی پیتے ہیں اور ایک بڑا کمرہ آراستہ ہے جو سٹنگ روم کہلاتا ہے یعنی ملاقات کا کمرہ۔ اس میں کبھی ہم سب مل بیٹھتے ہیں اور دل خوش کرتے ہیں اور جب کوئی دوست ہم میں سے کسی سے ملاقات کو آتا ہے تو اس کمرے میں ملاقات ہوتی ہے۔

مکان کی لائق اور مستعد خادمائیں

ہماری مہربان لینڈلیڈی نے ہمارے کاموں کے انجام کے لیے دو نوکریں رکھی ہیں' ایک کا نام این اسمتھ ہے اور دوسری کا ایلیزبتھ ماتھیورز۔ پچھلی تو نو عمر غریب لڑکی ہے' متفرق کام کرتی ہے اور پہلی نہایت ہوشیار اور لائق پڑھی لکھی خوشخط باسلیقہ ہے۔ کتابیں پڑھ سکتی ہے تمام ضروری مضمون لکھ سکتی ہے' اخبار پڑھ سکتی ہے اور اس سے خوشی حاصل کر سکتی ہے۔ اپنا متعلق کام اس خوبی سے انجام دیتی ہے کہ جیسے کوئی کل یا گھڑی بلا تفاوت باقاعدہ اپنا کام کرتی ہے۔

ہم اپنے سونے کے کمرے میں سے بعد فراغ تمام ذاتی کاموں کے پوری پوشاک پہن کر قریب ساڑھے آٹھ بجے کے اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں آتے ہیں۔ اس عرصے میں این اسمتھ دونوں کمرے صاف کر رکھتی اور ہر چیز' کیا چوکی اور کیا میز اور کیا الماری اور کیا تصویریں اور کیا قلمدان اور کیا کتابیں غرض کہ تمام چیزیں جھاڑ پونچھ کر اور آراستہ کر کے اپنے اپنے موقع پر رکھ دیتی ہے۔ آتشدان میں بقدر حالت سردی کے آگ جلا رکھتی ہے' اگر کوئی چٹھی کسی کے نام کی آئی تو اس نے ہر ایک کا نام پڑھ کر ہر ایک کی نشست کی چوکی کے آگے رکھ دی' اگر کوئی اخبار ہوا تو اس کو سب کے بیچ میں رکھ دیا کہ جس کا دل چاہے وہ اول لے کر پڑھے۔ غرضیکہ ہم کمرے میں آئے' سب چیز کو آراستہ پایا۔ قریب نو بجے کے وہ کمرے کے دروازے پر آئی اور دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آنے کی اجازت چاہی' جب معمولی الفاظ سے اجازت ملی وہ اندر آئی اور کھانے کی میز پر چادر بچھائی اور بریک فاسٹ کا سامان سب تیار کیا۔ تمام گفتگو نہایت شستہ' نہایت مودب اور باوجود مودب ہونے کے خوش خو' اخلاق اور انسانیت سے بھری ہوئی' ہر ایک سے "سر" کہہ کر بات کہنی' حامد کو مسٹر حامد' محمود کو مسٹر محمود اور مرزا خداداد بیگ کو مسٹر بیگ نہایت ادب آمیز طریقہ سے کہنا اور چونکہ وہ جان گئی ہے کہ مرزا خداداد بیگ کا یہ پورا نام نہیں ہے ایک آدھ دفعہ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ "سر پلیز پارڈن می' یور فل نیم از ویری ڈیفیکٹ"

یعنی آپ مجھے معاف فرمائیں جو میں نے اپ کا پورا نام نہیں لیا۔ آپ کا پورا نام نہایت مشکل ہے۔

اب بڑا تماشا ہو گیا ہے کہ ہم سب نے مرزا خداداد بیگ کا نام مسٹر بیگ رکھ دیا ہے۔ غرض کہ اسی طرح تمام چیزیں وقت پر موجود اور تیار رکھتی ہے اور ڈنر اور سپر سب کا سامان اسی طرح خوبی و درستی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔ اس نو عمر لڑکی ایلزبتھ ماتھیوز کو دیکھو کہ باوجود قلت تنخواہ کے ہمیشہ ہاف پنی والے اخبار جس کا نام "ایکو" ہے مول لیتی ہے اور جب کام سے فرصت

ملی تو اس کو پڑھتی ہے، کبھی پنچ اخبار کا کوئی پرچہ لے کر اس میں جو تصویریں عورتوں کو میسرز اور کسٹم پر ہوتی ہیں ان کو دیکھتی ہے اور اس کے ایڈیٹر کے کنایئے اور اشارے کو پڑھتی ہے اور طبعیت خوش رکھتی ہے۔

گورنمنٹ کے ہندوستانی افسران کے متعلق ایک تحریک

میں نے یہاں بڑی غل مچائی ہے کہ ہندوستانی افسروں کو جو ولایت آنا چاہیں، رخصت بلا وضع تنخواہ ملنی چاہیے۔ اکثر ممبران انڈیا کونسل کان بھی میری فریاد پر رکھتے ہیں، چنانچہ میں نے اپنی درخواست پیش کی ہے، نقل اس کی آپ کے ملاحظے کو بھیجتا ہوں۔ اگر یہ ہوگیا تو بلاشبہ آپ کو رخصت پوری تنخواہ پر مل سکے گی۔ 9 جولائی 1969ء

مسٹر ڈیون پوٹ کی کتاب کی طباعت کی تکمیل

جس کتاب کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہوگئی۔ ہفتے یا دو ہفتے کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس روانہ کروں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے موافق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے، جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔

مسلمان حکمرانوں کے متعلق انگریزوں کی
غلط بیانیاں اور ان کی تصحیح کی ضرورت

اب ایک اور بات ضروری ہے جو لکھتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمانوں بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہیں کتابوں کو پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ ازراہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے، اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں، اس لیے اس قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا وہ نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔

اندلس اور صلیبی محاربات کے متعلق دو

تاریخیں انگریزی میں لکھوانے کا خیال

دو بہت بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے۔

ایک واقعہ اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اس قوم کی کی' عجیب اور قابل فخر ہے۔

دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور تمام عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اس عالم صاحب سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں اور ان کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا قصور اس میں ان کی منصفانہ رائے میں ہو' سب لکھیں اور چونکہ وہ عالم صاحب نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن' فرنچ' لیٹن' گریک زبانیں جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے صرف انگریزی کتابوں پر اس کو بھروسہ نہیں ہے اس لیے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اس نے یہ کتاب لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔

ان دونوں کتابوں کے لیے چندے کی تحریک

ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً" خرچ ہو گا' فی کتاب چار سو روپیہ۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کر کے میرے پاس بھیج دیں۔ چندہ کرنے میں شہرت نہیں ہونی چاہیے اور صرف احباب مخلصین سے چندہ ہو' مثلاً" آپ' میر ظہور حسین' زین العابدین' مرزا رحمت اللہ اور احباب سے ملاقات کریں اور زبانی بات چیت کریں اور جو جو جس کی توفیق ہو اس سے لے کر جمع کر دیں۔

مسٹر ڈیون پوٹ کی تحقیق کہ

کتب خانۂ اسکندریہ مسلمانوں نے نہیں جلایا

ایک عجیب بات سنئے کہ جو کتاب چھپ چکی ہے اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ جو الزام جلا دینے کا کتب خانہ مصر کا نسبت حضرت عمرؓ کی لگایا جاتا ہے' غلط ہے اور یونانی اور رومی تاریخوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر کے وقت میں جلا۔ (بیوقوف' شیخی پسند' بعض ناواقف مسلمان مورخوں نے اسی واقعہ کو مسلمانوں نے جب مصر فتح کیا اسی کے ساتھ (لگا دیا) اس

امر کا ایسا مستحکم ثبوت دیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا جس میں ذرا شبہ نہیں ہو سکتا۔

خطبات احمدیہ کے ایک باب کی تیاری.

مواعظ احمدیہ کا ایک وعظ تیار ہو گیا' انگریزی میں ترجمہ ہو گیا۔ اب انگریزی میں چھاپہ شروع ہو گا' اردو کتاب کے چھاپہ میں یہاں بہت لاگت لگتی ہے' بعد چھاپہ چند نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔

23 جولائی 1969ء

حمایت اسلام میں جان ڈیون پوٹ کی کتاب کی طباعت

آپ کا عنایت نامہ 28 جون پہنچا۔ عجب اتفاق ہے کہ میرا نیاز نامہ مورخہ 4 جون آپ کے پاس پہنچا اور جو عریضہ مع اشتہار کتاب (مسٹر جان ڈیون پوٹ) اس سے پہلے روانہ کیا تھا وہ نہیں پہنچا۔ غالباً" عریضہ سو تھمپٹن کی راہ گیا جو نہایت پھیر کا رستہ ہے مگر امید ہے' بعد اس کے پہنچ گیا ہو گا۔ ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر جان ڈیون پوٹ ہے حمایت اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ جناب پیغمبر خدا ﷺ کا حال لکھا ہے اور جس قدر اتہام اور الزام انگریزوں نے آنحضرت ﷺ پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں' اس کا جواب دیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی' اس کا چھاپا ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا'

میور صاحب کا جواب لکھنے کی تڑپ

ان دنوں میں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت ﷺ کے حال میں لکھی ہے' اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر' دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا' کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے' قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا' حاضر کرو ع

مارا تمغہ شہنشاہی' بس است

جواب کے لیے کتب کی فراہمی

میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دیں، چٹھیات روانہ ہو گئیں، سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتب لیٹن کی خرید لیں، ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کے مضمون بتلا سکے، تین مقدمات لکھنے شروع کر دیے۔ اول جغرافیہ عرب و دوم انساب عرب، سوم ثبوت آنحضرت ﷺ کی نسل کا حضرت ابراہیمؑ تک۔ سب سے مشکل کام جغرافیہ ہے اور تمام چیزوں کے متعلق اسلام و سیر کے ثبوت کی بنیاد ہے۔ خیر اب دعا کرو خدا مدد کرے اور انجام کو پہنچا دے "ھرچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم"۔ ایک نہایت عمدہ ثبوت نسل ابراہیمؑ سے ہونے کا یہ ہے کہ بنی ہاشم اور دیگر اقوام عرب میں جو اولاد حضرت ابراہیمؑ سے ہیں، رسم ختنہ جاری تھی۔ آپ تلاش کریں کہ کسی کتاب میں یا حدیث و سیر و تفسیر میں کوئی ایسی قوم بھی عرب میں پائی جاتی ہے جس میں رسم ختنہ نہ ہو۔ عرب میں سوائے اولاد حضرت ابراہیمؑ کے اور قومیں بھی آباد تھیں، اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ ان قوموں میں رسم ختنہ نہ تھی تو نہایت عمدہ بات ہے۔ نقول مقالات جو سابق میں طلب کی ہیں، یقین ہے کہ اب تک روانہ ہو چکی ہوں گی۔

حامد کی تعلیم لندن میں

حامد کچھ دل پڑھنے پر نہیں لگاتا، بہرحال گھر میں پڑھتا ہے۔ سو روپے مہینے کا آدمی نوکر ہے جو تین گھنٹے آکر حامد کو اور لیٹن محمود کو پڑھاتا ہے مگر حامد کا دل نہیں لگتا ہے۔

درباروں میں شرکت اور امراء و وزراء سے ملاقاتیں

دربار ملکۂ معظمہ کی حاضری کے لیے مجھ سے کہا گیا مگر میں نے بعض مصلحت کی نظر سے کہا ہے کہ پھر کسی دربار میں حاضر ہوں گا، ہمیشہ دربار ہوتے ہیں۔ یہاں کے امراء سے دوستانہ ملاقات نہایت بے تکلف ہوتی ہے اور کھانے پر جانا ہوتا ہے۔ ہمیشہ محمود میرے ساتھ ہوتا ہے اور وہ ذریعہ گفتگو اکثر ہوتا ہے۔ وزیر ہند سے ایک دفعہ مع حامد و محمود ملاقات ہوئی تھی اور دو دفعہ صرف میں تنہا ملا۔ میں نے انگریزی میں ان کی سب باتوں کا جواب دیا، سب سمجھا اور سب جواب صحیح دیئے

خطبات احمدیہ کی مکمل تیاری

کتاب جلد بندی سے تیار ہو گئی اور فروخت کو رکھی گئی۔ خدا کرے کچھ بک جاویں اور اس بے انتہا مصیبت سے مجھے کسی قدر سبکدوشی ہو۔ اگر ممکن ہوا تو اسی ڈاک میں ورنہ آئندہ ڈاک

میں ایک جلد آپ کے پاس اور ایک ایک ہر ایک اہل چندہ کے نام روانہ کروں گا۔

لندن میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" کی ابتدائی تیاریاں

(ہندوستان پہنچ کر) ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے اور "تہذیب الاخلاق" اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں "محمدن سوشل رفارمر" رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوب صورت یہاں کھدوالیا ہے' کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعۂ جہاز بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جائیں گی۔ خرچ ماہواری اجرا اس اخبار کا سو روپیہ ہو گا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینا کر کے دیں گے اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور بہ قیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا اس میں میں اور آپ (محسن الملک) دو شخص آرٹیکل لکھنے والے ہوں گے اور اگر صلاح ہو گی تو منشی ذکاء اللہ صاحب کو اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شریک کریں گے غرض کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے وہاں پہنچنے تک آپ کچھ نہ کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں عنقریب وہاں پہنچتا ہوں۔

لندن سے روانگی کی اطلاع

میری روانگی کا زمانہ بالکل مقرر ہو گیا اور سکرٹری آف اسٹیٹ کو اطلاع دے دی گئی اور منظوری ہو گئی۔ اب میں انشاء اللہ مع حامد یہاں سے حسب مندرجہ ذیل روانہ ہوں گا۔

28 اگست 1870ء کو انشاء اللہ تعالیٰ میں لندن چھوڑوں گا' ایک ہفتہ مصر میں رہوں گا اور انشاء اللہ تعالیٰ مع الخیر 2 اکتوبر 1870ء کو بمبئ میں پہنچوں گا اور چوتھی پانچویں کو انشاء اللہ تعالیٰ الہ آباد میں آپ کا جمال مبارک دیکھوں گا۔ ان دنوں میں تعطیل دسہرہ کی ہو گی 26 اکتوبر تک۔ اگرچہ دہلی جانے کو مطلق دل نہیں چاہتا مگر بہ مجبوری بہن اور بھتیجوں کے سبب ایک دن کے لیے جانا پڑے گا۔ باقی ایام تعطیل علی گڑھ میں اور کچھ مرزا پور میں بسر کروں گا۔

مکتوبات

بنام مولانا الطاف حسین حالی

اس خط میں سرسید کی درد مندی' حالی سے تعلق خاطر اور تنقیدی شعور' سب باتیں یکجا ہو گئی ہیں' سرسید ہر ذریعہ اور وسیلہ کو قوم کی تعمیر اور بیداری کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے رنڈیاں مسدس گائیں اور لڑکے ڈنڈے پر گاتے پھریں۔ پھر وہ حق تصنیف محفوظ کرنے کے حق میں نہ تھے تاکہ مسدس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔

مرتب

جناب مخدوم و مکرم من!

عنایت نامجات بمع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی' جب تک ختم نہ ہوئی' ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے' بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ' جھوٹ' تشبیہات دور از کار سے ہے' جو مایۂ نازِ شعرا و شاعری ہے' بالکل مبرا ہے' کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں ہیں جو بے چشمِ نم نہیں پڑھے جاسکتے۔ حق ہے' جو دل سے نکلتی' دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ ار نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا

ہوں، اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمایئے۔ یہ بھی لکھئے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب تک موجود ہیں....

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرستہ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرادی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو، جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف (دہلی جمع) ہوں اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو "تہذیب الاخلاق" میں چھاپوں گا۔ میرے ان استفسار کا جواب، جن پر نشان درج کر دیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو۔

خاکسار، آپ کا احسان مند تابعدار سید احمد والسلام

شملہ - پارک ہوٹل، 10 جون 1879ع

بنام اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی نے علی گڑھ تحریک اور سرسید پر جو مخالفانہ اشعار کہے وہ اب تک فضا میں گونج رہے ہیں، مگر اس پر لوگوں کی نظر نہیں کہ اکبر نے سرسید اور علی گڑھ تحریک کی عملی امداد کی۔ یہ خط ملاحظہ ہو

مرتب

مخدومی و مکرمی منشی اکبر حسین خان بہادر

آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ آپ نے جو کامیابی حیدر آباد کی مبارک بادی ہے اس کا دل سے شکر گزار ہوں۔ یہ مبارک بادی در حقیقت قوم کی مبارک بادی ہے جس میں آپ بھی شامل ہیں، پس میں آپ کو بھی مبارک بادی دیتا ہوں

آپ نے عمدہ مادہ تاریخ فیاضی نظام کا نکالا ہے جو بے مثل ہے۔ اس پر چند مصرعے نہیں بلکہ چند اشعار لگا دیجئے جس میں کسی قدر حال قوم کی حالت کا اور ضرورت تعلیم کا اور ڈیپوٹیشن کے نظام (کے) پاس جانے کا بھی ذکر (ہو)، تاکہ اس حال کے معلوم ہونے سے مادہ تاریخ کی خوبی اور عمدگی ظاہر ہو۔ گرچہ اس میں آپ کو تکلیف ہو گی مگر آپ کی یادگار بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ رہے گی۔ والسلام

خاکسار
سید احمد

بنام نواب وقار الملک (مولوی مشتاق حسین)

حیدر آباد دکن میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہونے سے پہلے مولوی مشتاق حسین ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی اہل کار تھے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے عدالت کے اوقات میں جماعت کے ساتھ نماز ظہر کی ادائیگی سے انہیں منع کیا۔ انہوں نے سرسید کو سارا معاملہ لکھ بھیجا۔ سرسید کا جواب ملاحظہ ہو۔ ایمان اور اعتماد باللہ کا مرقع ہے۔

مرتب

بھائی مشتاق حسین!

کل میں سارا دن متردد رہا، کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا، دو دو اکٹھی بھی ملا کے پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے نماز ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت۔ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے، مگر

تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت لچرپنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ "تم نماز نہ پڑھو" (تو) اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کیسا۔ "حضور رخصت ہی دیں۔" "تنخواہ کاٹ لیں" کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفاء دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ "میں اپنے خدائے عظیم الشان، قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔" کیا ہوتا، نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مرجاتے؟ نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام۔

خاکسار

سید احمد

از بنارس، 9 جنوری 1875ء

بنام مولانا سید میر حسن سیال کوٹی

شمس العلماء سید میر حسن علامہ اقبال کے استاد تھے۔ اقبال کو ان سے جو عقیدت تھی اس کا اندازہ التجائے مسافر کے اشعار سے ہوتا ہے۔

مولانا میر حسن نے غلام احمد قادیانی کے بارے میں سرسید سے سوال کیا۔ شاید میرزا کا دعویٰ اس وقت تک الہام کا تھا' نبوت کا نہیں۔ سرسید نے کس بالغ نظری سے ان کی حقیقت بیان کر دی کہ ان کی تصانیف "نہ دین کے کام کی ہیں نہ دنیا کے کام کی۔" ہاں ان کی نیکی کے بارے میں سرسید کو غلط فہمی تھی اور نبوت مرزا کے مضمرات اس وقت تک ابھر کر سامنے نہ آئے تھے۔

مرتب

مخدومی مکرمی!

آپ کے نوازش نامے کا نہایت شکر ہے۔ پانچ روپیہ چندہ بھی پہنچے۔ اس کا بھی شکر ہے۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے کہ تفسیر لکھنے میں ہرج پڑ جاتا ہے' مگر جب موقع ملتا ہے لکھتا ہوں۔ تفسیر سورہ یوسف بھی تمام ہو گئی ہے اور چھپ رہی ہے۔

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے بہتر۔ ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے نہ دنیا کے۔ ان کا الہام ان کو مبارک رہے۔ اگر نہیں ہوتا اور صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے۔ وہ جو ہوں سو ہوں' اپنے لیے ہیں۔

جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے۔ ان کی تصانیف میں نے دیکھیں۔ وہ اسی قسم کی ہیں جیسا ان کا الہام۔ یعنی نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔

خاکسار

سید احمد

علی گڑھ' 9 دسمبر 1891ء

بنام سید حسین بلگرامی عماد الملک

(1)

مخدومی و مکرمی باعث افتخار قوم نواب عماد الملک بہادر!

آج ایک چک مرسلہ بنک بنگال حیدر آباد دو ہزار چار سو میرے پاس آئی۔ اس کے ساتھ جو چھٹی ایجنٹ بنک کی ہے اس میں صاف یہ لکھا ہے کہ حسب خواہش اکو نٹٹ جنرل گورنمنٹ نظام یہ روپیہ بھیجا جاتا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جیسا آپ نے پہلے لکھا تھا کہ جن سنوں کا روپیہ "نظام وظیفہ" کا چڑھ گیا ہے وہ بھیج دیا جاوے اور آئندہ کے لیے کوئی تجویز ہو گی کہ وہ جاری رہے گا یا نہیں۔ بہرحال میں آپ کی اس توجہ کا کہ زرِ باقیاتِ سابق وصول ہو گیا' دل و جان سے شکر ادا کرتا ہوں۔ خدا نے آپ کی سعی و کوشش کو کامیاب کیا۔ خدا کا شکر ہے۔

اس امر میں کہ آئندہ بھی "نظام وظیفہ" جاری رہے گا یا نہیں' شبہ ہے۔ مجھ کو تو اس کے آئندہ جاری رہنے میں مایوسی ہے۔ مگر جو اس وقت ایک مشکل پیش آگئی ہے اس کی اطلاع آپ کو' کیا بحیثیت ٹرسٹی کالج اور کیا بحیثیت پیش افسر گورنمنٹ نظام' دینی ضرور ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ جو کچھ (اس کے متعلق) آپ سے ہو سکے گا' آپ ضرور کریں گے۔

حال یہ ہے کہ گورنمنٹ شمال مغرب نے حکم دیا ہے کہ کُل گورنمنٹ کالجوں اور ایڈڈ کالجوں میں' جیسا کہ ہمارا کالج ہے' کالج کلاس کے طالب علموں کی فیس کا اضافہ کیا جاوے۔ ایم۔ اے کلاس کے طالب علموں کے لیے فیس بارہ روپے تجویز کی گئی ہے اور بی اے کلاس کے طالب علموں کے لئے دس روپے ماہواری اور انٹرمیڈیٹ یا ایف۔ اے کلاس کے طالب علموں کے لیے آٹھ روپے ماہواری۔ یہ شرحِ فیس تعلیم کی اس قدر گراں ہے کہ اکثر مسلمان طالب علم بلکہ کلیتہً اس اس کے ادا کرنے سے معذور ہوں گے اور ایک شدید نقصان مسلمانوں کی تعلیم میں پہنچے گا۔ اس وقت ہمارے کالج کی کلاسوں میں ایک سو پچھتر سے زائد طالب علم صرف مسلمان ہیں' لیکن فیس کے اضافہ ہونے کے بعد شاید بمشکل صرف نصف طالب علم باقی رہیں گے اور وہ بھی اس صورت میں کہ وظیفہ یا اسکالر شپ سے ان کی اعانت کی جائے۔ ایسی حالت میں اگر "نظام وظیفہ" جاری رہ سکنا ممکن ہو تو مسلمانوں کو نہایت مدد پہنچ سکتی ہے۔ لیکن چونکہ چاروں طرف سے مسلمانوں کو بد نصیبی نے گھیر لیا ہے اور گھیرتی جاتی ہے اس لیے مایوسی کے سوا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ بہرحال ان امور کی اطلاع آپ کو کرنی مناسب تھی (اس لیے) کی گئی۔

ہمارا ارادہ ہے کہ اس روزلیوشن کی نسبت، جو گورنمنٹ سے جاری ہوا ہے، مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے عذر پیش کریں۔ عُذر کی چٹھی... مسٹر بک اور سید محمود لکھیں گے۔ مگر میری دانست میں کچھ ہونے والا نہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی بات گزرے تو اس سے اطلاع فرمایئے۔ والسلام۔

علی گڑھ، 9 اپریل 1895ع کمترین خاکسار، سید احمد

(2)

جناب مخدوم، و مکرم من باعثِ افتخارِ قوم نواب عماد الملک بہادر!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ 25 اپریل پہنچا اور میرے جان و مال اور روح کا باعثِ افتخار ہوا۔ جو کہ (چونکہ) آپ کی عنایت و توجہ سے دو برس کے بقایا وظائف نظامیہ مل گئے اس کا شکر ادا کرنا میری طاقت سے باہر ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ قوم کی ہمدردی جو آپ کے دل میں ہے وہ باعث ان سب باتوں کی ہے جو آپ نے کیں اور کرتے ہیں اور کریں گے یہ ظاہر ہے کہ حیدر آباد میں سوائے آپ کے یا مولوی چراغ علی کے کوئی ہمارا ہمدرد نہیں ہے مگر ہم کو ہر وقت خدا پر بھروسا ہے اور ہر وقت رہتا ہے کہ: ع

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

اگر خدا کو مسلمانوں کے حق میں کچھ بہتر کرنا ہے تو یہ مدرسہ قائم اور سرسبز رکھے گا ورنہ جو خدا کی مرضی۔ اس وقت کالج کلاسوں میں 205 طالب علم ہیں۔ منجملہ ان کے 168 مسلمان ہیں۔ اگر شمال مغربی اضلاع کے کُل کالجوں کے کالج کلاس کے مسلمان طالب علموں کو شمار کر لیا جاوے تو بھی ان کی تعداد ہمارے کالج کے مسلمان طالب علموں سے نصف سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

اسکول کلاسوں میں 361 طالب علم ہیں جس میں سے 289 مسلمان ہیں۔ یہ تعداد مسلمانوں کی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ غرض کہ کُل کالج اور اسکول کے طالب علموں کی تعداد 566 ہے اور لاء کلاس میں 90 طالب علم ہیں۔ پس کل تعداد طالب علموں کی 656 ہے۔ زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ 335 طالب علم بورڈر ہیں اور سب آپس میں ملے ہوئے اور نہایت شاداں و فرحاں رہتے ہیں۔ علاوہ معمولی تعلیم کالج کے "یونین کلب ہے جس میں وقتاً" فوقتاً" انگریزی زبان میں تقریریں اور مباحثہ ہوتا ہے۔

پھر ایک لجنتہ الادب ہے جس میں عربی خواں طالب علم اور مُدرس اور بعض دیگر احباب شریک ہوتے ہیں اور کُل گفتگو اور مباحثہ جو کچھ ہوتا ہے عربی زبان میں ہوتا ہے۔ اور جو عربی

میں نہایت عمدہ اور شستہ گفتگو کرتا ہے اس کو انعام دیا جاتا ہے۔ شاید اب کی دفعہ نذیر احمد' ایک طالب علم کو ، انعام ملے۔ عربی زبان کے اخبار جو مصر اور بیروت وغیرہ میں چھپتے ہیں' وہ اکثر لیے جاتے ہیں اور لجنتہ الادب کے ممبران کو بخوبی پڑھتے ہیں' اور یہ ذریعہ ان کو عربی میں گفتگو کرنے کا نہایت عمدہ ہے۔ علاوہ اس کے ایک مجلس اخوان الصفا کی ہے۔ اس کے پر۔سیڈنٹ مسٹر آرنلڈ ہیں اور منتخب طالب علم اس کے ممبر ہیں۔ یہ مجلس خاص لوگوں کی ہے۔ غیر شخص اس میں داخل نہیں ہوتا۔ ہر ایک طالب علم کے دل میں جو کچی بات ہے اس پر گفتگو کرتا ہے' اور طالب علم صدق دل سے اس کی اصلاح اور ترمیم یا تصدیق یا تردید کرتے ہیں۔ اس مجلس نے میری دانست میں طالب علموں کے اخلاق پر نہایت عمدہ اثر کیا ہے۔

علاوہ اس کے چار پانچ کلب جسمانی ورزشوں کے ہیں۔ جمناسٹک' کرکٹ' فٹ بال' قواعد' گھوڑے کی سواری یعنی رائڈنگ اسکول۔ گھوڑوں پر علاوہ معمولی مشق کے اس طرح پر بھی مشق کرتے ہیں جس طرح قواعد میں ہوتی ہے۔ کل بورڈران ورزش جسمانی میں شامل ہیں اور علی الصبح روز قواعد ہوتی ہے۔ الگ الگ جماعتیں طالب علموں کی بہ لحاظ عمر کے بنائی گئی ہیں۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دنوں میں ایک ریویو ہوا تھا جس میں قواعد کرنے والی جماعتیں اور گھوڑے پر قواعد کرنے والی جماعتیں سب شریک تھیں۔ اس وقت آپ مجھ کو بہت یاد آئے' کیونکہ آپ ہمیشہ اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ طالب علموں کو ورزش جسمانی کا مشتاق کرنا چاہیے۔ غرض کہ جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے قوم کی بھلائی اور بہتری میں کوشش کرتے ہیں۔ آئندہ اس کا قائم رہنا خدا کے اختیار میں ہے۔ آپ کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قوم اس کی کچھ قدر نہیں کرتی اور نہیں جانتی کہ کیا کچھ اس کی بہتری کے لیے ہو رہا ہے۔ اگر قدر کرتی تو ہم کو روپے کی بابت کسی سے کچھ پروا نہیں رہتی اور نہ کبھی اس بات کا تردد ہوتا کہ نواب سر سالار جنگ مرحوم کی جاگیر کا روپیہ' جو بند ہو گیا' وہ کمی ہم کیوں کر پوری کریں...

والسلام مع الاکرام

علی گڑھ' 3 مئی 1895ء

کمترین شما' سید احمد

بنام منشی سعید احمد

سر سید احمد خاں کی تحریروں' تقریروں اور طرز عمل سے یہ حقیقت ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ کالج کے طلبہ کے انداز فکر و نظر کو وہ

اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ اسلام طلبہ کے جسم میں خون کی طرح گردش کرے۔ اس سلسلہ میں ان کی عظمت یہ تھی کہ وہ بہت سے فکری اور عقائدی مسائل میں اپنی تحقیق اور نقطۂ نظر کا پرچار کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے اور اسلام کی اسی تاویل و تفسیر کو طلبہ تک پہنچانا چاہتے تھے جو اس کے عہد کے عام علماء کے مسلک کے مطابق تھی۔

ان کی وسیع النظری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے مولانا قاسم نانوتوی صاحب کے داماد کو معلم دینیات کے طور پر منتخب کیا۔ وہ ایسا استاد چاہتے تھے جو خالصتہ" رضائے الٰہی کے لئے تدریس کا فریضہ انجام دے' جس کی ذات میں خُلق محمدی کا پرتو ہو اور ایسے استاد کا مدرسے میں تشریف لانا وہ "باعث خیر و برکت" سمجھتے تھے۔ سرسید کی تمنا تھی کہ اسلام طلبہ کی ذات کا حصہ بن سکے اور ان کے دلوں سے شک کے کانٹے شفقت کے ذریعہ چُنے جاسکیں

مرتب

مشفقی منشی حافظ سعید احمد صاحب!

مولوی عبداللہ صاحب کا خط جو آپ نے بھیجا' میں نے نہایت خوشی سے پڑھا۔ قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دوں' اپنے خیالات کا ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ سب سے اول یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے ہم ایک بزرگ اور مقدس شخص کو بورڈنگ ہاؤس میں رکھنا چاہتے ہیں وہ ایسا ہو کہ درحقیقت اس کام میں اس کو مالی فائدے پر نظر نہ ہو اور نہ مالی فائدے کو مقدم سمجھے۔ بلکہ ان کا اصلی مقصد اور ان کی سچی نیت خالصا" للہ یہ ہو کہ مدرستہ العلوم ایک ایسی جگہ ہے جہاں کثرت سے مسلمان نوجوان جمع ہیں۔ ان میں نیکی اور اخلاق محمدیؐ اور محبت اسلامی اور پابندئ فرائض مذہبی کو پھیلانا اور ان کے دلوں کو نرمی اور اخلاق سے' نہ تشدد اور سختی اور (نہ) تعصب اور شقت سے' نیکی طرف مائل کرنا ایک مذہبی اور ثواب کا کام ہے۔ ہزاروں جاہلوں کے مجمع میں وعظ کہہ دینے سے ایسے لوگوں میں' جو اس زمانے کے علوم کی تعلیم میں مصروف ہیں اور نوجوان ہیں' نیکی اور اخلاق محمدیؐ کا پھیلانا اور فرائض مذہبی کی طرف مائل کرنا ہزار درجے بہتر ہے اور اسلام اور قوم کے لیے زیادہ مفید ہے۔ پس یہ مقصد ایسے ہی شخص سے حاصل ہو سکتا ہے جس کی نیت اور ارادہ خالصتا" بلاکسی قسم کے لالچ اور دنیاوی طمع کے اس کام کے کرنے کا

ہو اور یہ سمجھے کہ میں اسلام کی خدمت کرتا ہوں۔ پس اگر مولوی عبداللہ صاحب اسی نیت سے یہاں آنا چاہیں تو ہماری عین خواہش اور خوشی ہے۔ علاوہ اس کے میں دنیاوی فائدے کی نظر سے دینی کاموں کو انجام دینا یا دلوانا ناجائز بھی نہیں سمجھتا۔

مولوی عبداللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے' نواسے ہیں (مولوی) مملوک علی صاحب کے' داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب (نانوتوی) کے اور ان سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی۔ اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ لحاظِ محبتِ اسلام انجام دیں۔ اور اسی خیال سے میں ان کا مدرسے میں تشریف لانا اور یہاں رہنا باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔

مدرسے میں قیام پذیر ہونے میں جن کاموں کی انجام دہی کی ان سے خواہش ہے وہ یہ ہیں:

1- اول' مسجد کا اہتمام اور نمازِ پنج گانہ کا انتظام ان کے متعلق رہے اور پانچوں وقت کی نماز وہ خود پڑھا دیا کریں۔ ان کے سبب سے جماعت کو ترقی ہو گی اور طالب علموں کو نمازِ باجماعت کی زیادہ ترغیب ہو گی۔

2- دوسرے' یہ کہ کبھی کبھی جمعہ کی یا اور کسی نماز کے بعد بطور وعظ کے طالب علموں کو کسی قدر نصیحت کر دیا کریں۔

کالج کے طالب علم خود تعلیم یافتہ ہیں اور متعدد قسم کے علوم سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے لیے زیادہ تر مفید یہ ہو گا کہ اخلاق اور عادات محمد الرسول ﷺ سے اور صحابہ کرام اور دیگر بزرگان دین کی نیکیوں اور حسنِ اخلاق اور خدا پرستی اور خدا کی محبت اور احکام مذہبی کی ہمدردی' عقائدِ مذہبِ اسلام کی خوبی اور سادگی' وحدانیتِ خدا کی عظمت و شان' قرآن مجید کی خوبی اور جناب رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام کی ہدایات کی خوبی اور برتری سے وقتاً فوقتاً ان کو آگاہ کیا جاوے' جس سے طالب علموں کے دلوں میں نیکی پیدا ہو اور ان کے دل سچائی اور باہمی محبت اسلامی اور نیکی کی طرف مائل ہوں۔

مدرسے میں شیعہ اور سُنی دنوں قسم کے طالب علم ہیں۔ ان کو صرف سُنی طالب علموں کی ہدایت سے تعلق رکھنا چاہیے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رہے کہ کوئی ایسا امر واقع نہ ہونے پائے کہ جس سے مابین سُنی اور شیعہ طالب علموں کے کوئی رنجش یا تکرارِ مذہبی پیدا ہو۔

ان کو اس بات پر (بھی) توجہ کرنی چاہیے کہ ان کا ادب اور ان کی محبت طالب علموں کے دلوں میں پیدا ہو' اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود طالب علموں کے ساتھ اخلاق و محبت سے پیش آویں اور انہی کا اخلاق و محبت طالب علموں کی ہدایت اور ان میں نیک دلی پیدا ہونے کا ذریعہ وہ گا۔ خدا نے رسول ﷺ سے فرمایا کہ "فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم

و لو کنت فظاً غلیظ القلب لا انفضوا من حولک"۔ پس علما کا بھی یہی فرض ہے کہ اس رحمت سے خود فائدہ اٹھا کر لوگوں کی ہدایت کریں۔ میرے نزدیک تعصب و تسلب اور شقت اختیار کرنا خلافِ حکمِ خدا اور خلافِ طریقۂ محمد رسول ﷺ اور خلافِ انسانیت ہے، اور اس طریقے سے ہرگز کسی کو ہدایت نہیں ہو سکتی، بلکہ نفرت پیدا ہوتی ہے۔

زیادہ تر میرا مقصد یہ ہے کہ طالب علموں کے دلوں میں نمازِ پنج گانہ اور با جماعت نماز ادا کرنے کا شوق پیدا ہو یا عادت پڑ جاوے۔ اگرچہ ہمارے کالج میں ایک خاص شخص نماز کی حاضری لینے کو معین ہوتا ہے اور جو لوگ جماعت میں غیر حاضر ہوتے ہیں ان سے مواخذہ کیا جاتا ہے اور تدارک بھی ہوتا ہے، مگر میری رائے میں اس سے چنداں فائدہ نہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ جو شخص حاضری لیتا ہے وہ ان لوگوں کے نام سے، جو بلاوجہ اکثر جماعت سے غیر حاضر ہوتے ہیں، مولوی صاحب کو اطلاع کرے گا اور مولوی صاحب کسی وقت ان کو علیحدہ تخلیے میں بلا کر نصیحت کریں گے اور سمجھاویں گے کہ نماز پڑھنی اور جماعت میں شریک ہونا چاہیے۔ اگر کچھ نہیں تو اس طریقے سے شوکتِ اسلام اور شوکتِ جماعتِ مسلمانان ثابت ہوتی ہے۔ غرض کہ اس قسم کی مشفقانہ نصیحتیں زیادہ کار آمد ہوں گی اور ان دنیاوی سزاؤں سے، جو پرنسپل صاحب نماز کی غیر حاضری کے سبب دیتے ہیں، زیادہ تر کارگر ہوں گی۔

اسی طرح (اگر) مولوی صاحب کو معلوم ہو کہ (کالج کے) کسی لڑکے کے عقائدِ مذہبی میں فرق ہے یا اور کسی مذہبی مسئلے میں اس کو شبہ ہے تو تخلیے میں مشفقانہ طریق پر اس کو سمجھاویں اور جہاں تک ان سے ہو سکے اس کے شبہے کو دور کریں۔

جو لڑکے قرآن مجید پڑھے ہوئے نہیں ہیں ان کو مسجد میں صبح کے وقت یا اور کسی وقت تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھایا جاتا ہے اور اس کے لیے جداگانہ حافظ مقرر ہے۔ مولوی صاحب کو مناسب ہو گا کہ اس پر بھی نگرانی رکھیں تاکہ تعلیم قرآن مجید کی بخوبی جاری رہے۔

ان کاموں کے سوا کوئی کام مدرسے کا ان سے متعلق نہ ہو گا، لیکن اگر کوئی طالب علم قرآن مجید کے معنی یا کوئی حدیث یا کوئی اور مذہبی کتاب پڑھنا چاہے تو اس کا پڑھانا بھی ان کی خوشی پر منحصر ہو گا اور امید ہے کہ مولوی صاحب ایسے کام سے انکار نہیں کریں گے۔

مولوی صاحب کو دن رات مدرسے میں ایک خاص مکان میں، جو مسجد کے ضلع میں ہو گا، رہنا ہو گا اور جن دنوں میں کہ مدرسہ بند ہوتا ہے، یعنی مدرسے میں تعطیل ہوتی ہے، ان دنوں میں اور نیز بحالت ضرورت بحصول رخصت وہ اور جگہ جا سکیں گے۔ اور اسی امر کی بابت نہ بہ معاوضہ انجام امور دینی ہم ان کو بخوشی معاوضہ دیں گے کیونکہ ان قیود کے سبب وہ اور طرح پر اپنی معاش حاصل کرنے سے معذور ہو جاویں گے۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان سب امور سے مولوی صاحب کو اطلاع دیجیے۔ اگر ان کو منظور ہو تو میں فی الفور ان کے رہنے کے لیے ایک مکان منجملہ مکانات متعلقہ مسجد کے تیار کر دوں۔ اور مجھ کو امید ہے کہ جب مولوی صاحب یہاں آئیں گے تو ہر مذہب کے طالب علموں اور کالج کے افسروں سے اپنا ایسا طریقہ برتاؤ رکھیں گے جو اوروں کے لیے ایک نمونہ اسلامی اور محمدی اخلاق کا ہو گا۔ فقط والسلام

خاکسار، سید احمد

علی گڑھ، 5 جون 1893ء

بنام مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی

مخدوم و مکرم من جناب مولوی عبدالحق صاحب سلمہ، اللہ تعالیٰ،

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ آپ نے جو عنایت نامہ میرے نام سید الاخبار، دہلی نمبر 17 میں چھاپا ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ آپ جو یہ استفسار فرماتے ہیں کہ مدرستہ العلوم مسلمانان میں (وہ) کون سے علوم ہوں گے جن سے اہلِ اسلام ترقی دینا حاصل کریں گے؟ تو (اس کے جواب میں عرض ہے کہ) اگر آپ از راہ عنایت اس طریقۂ تعلیمِ مسلمانان پر غور فرمائیں گے جو کمیٹی میں پیش ہوا ہے اور ہمراہ پرچہ، تہذیب الاخلاق، مطبوعہ 15 ذی الحجہ 1289ھ تقسیم ہوا ہے، تو آپ کو ان سب علوم کا، جو مدرستہ العلوم مسلمانان میں پڑھانے تجویز ہوئے ہیں، بخوبی حال معلوم ہو جائے گا اور اس وقت آپ یہ رائے قائم فرما سکیں گے کہ ان علوم کے پڑھنے سے دین اور دنیا دونوں میں ترقی ہونے کی امید ہے یا نہیں؟

آپ نے تصور فرمایا کہ مدرستہ العلوم کی تعلیم سے (مقصد) ہاتھ آنا سرکاری نوکریوں کا اصلی مقصود ہے، اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ سرکار میں اتنی نوکریاں کہاں ہیں جو مسلمانوں کو دے گی؟ جناب من! آپ نے مقصود مدرستہ العلوم پر غور نہیں فرمایا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پا جائیں کہ بلا ذریعہ نوکری خود اپنے قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور جو کہ مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لیے مستقل مدرسے کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ آخر جو آپ نے نصیحت ناپائیداری دنیا لکھی ہے اور ارقام فرمایا ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ ہر دم کو دم واپسیں جانے اور اللہ کی یاد

سے غافل نہ ہو" بلاشبہ یہ عمدہ نصیحت ہے۔ مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس کو ہر کوئی اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل سب جانتے ہیں مگر افسوس کہ کرتا کوئی نہیں۔ اگر آپ خود ہی اس پر عمل رکھتے ہوتے تو اخیر خط میں یہ ارقام نہ فرماتے کہ " نحن منتظر للجواب" کیوں کہ آپ کو یقین تھا کہ آپ میرا جواب پہنچنے تک زندہ رہیں گے۔ اس وقت آپ کو اپنی اس نصیحت کا کہ ہر دم کو دم واپسیں جاننا چاہیے، کیوں خیال نہ رہا؟ مجھ سے آپ سے ملاقات نہیں ہے اور نہ آپ کے حال سے واقف ہوں اس لئے میں نہیں جانتا کہ آپ کس حال میں ہیں، مگر میں نہایت ادب اور عاجزی سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اپنے رہنے کی کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بھی بنوائی ہے؟ برسات کی تکلیف سے بچنے کے لیے گھر کی چھت پر مٹی ڈلوائی ہے؟ کبھی اپنے رہنے کے لیے چھپر ڈلوایا ہے؟ آپ کے پاس پہننے کے کئے جوڑے ہیں؟ جن میں سے ایک آدھ تو آپ پہنے ہوئے ہوں گے اور باقیوں کو آئندہ پہننے کے لیے رکھا ہو گا۔ کم سے کم نان بائی یا بھٹیارے کو صبح شام کی روٹی پکانے کا حکم دیتے ہوں گے اور اس ماہِ مبارکِ رمضان میں سحری کے لیے بھی کچھ ضرور اٹھا رکھتے ہوں گے۔ مگر آپ کو اس نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق نہیں ہوتا کہ "شاید ہمیں نفس نفسِ واپسیں بود۔" پس جس بات پر کہ آپ کبھی عمل نہیں فرماتے، دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں نصیحت فرماتے ہیں؟ جناب ایسی باتیں کہہ دینی اور لکھ دینی بہت آسان ہیں مگر اس پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔

بندہ نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، مگر ابیض نورانی کا سب کو محتاج پایا۔ پھر بھلا آپ ایسی باتیں جاہل مسلمانوں کے برباد کرنے کو کیوں فرماتے ہیں؟ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے۔ جس سے خدا اور رسولؐ نے منع فرمایا اس سے ہم کو پرہیز کرنا چاہیے۔ جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لیے حلال اور مباح اور خدا کی نعمت ہے۔ ہم کو شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی مطابقت میں خدا کی نعمتوں کو لوٹنے دو۔ برائے خدا آپ کو کیا نقصان ہوتا ہے؟ وہ تو ہمارے خدا کی نعمتیں ہیں۔ اس نے ہمارے لیے بنائی ہیں۔ پھر ہم نہ لوٹیں گے تو (اور) کون لوٹے گا۔ ہاں خدا سے یہ دعا مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب سے مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے خدا کو جس نے وہ نعمتیں ہمارے لیے وقف کر دیں، نہ بھول جائیں۔ مروت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی بھلائی پر کوشش کرے۔ پس آپ بھی اپنے بھائی مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشش کیجئے اور لوگوں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان کے لیے للہ چندہ مانگتے پھریئے اور جمع کر کے میرے پاس بھیجتے جایئے۔ حقیقت میں یہ بات ہر دم کو دم واپسیں سمجھنے پر عمل کرنے کی ہو گی، کیونکہ وہ کام اپنے لیے نہ ہو گا بلکہ دوسروں کے لیے ہو گا۔ امید

ہے کہ آپ میری اس عرض پر دلی توجہ فرمائیں گے۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

راقم۔ آثم، سید احمد

از بنارس، 5 نومبر 1873ء

ایک معزز انگریز کے نام

یہ خط "حیات جاوید" سے نقل کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید اسلام اور آزادی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے دین اور عرب خون پر نازاں ہیں۔ یہ نسل پرستی نہیں بلکہ ان روایات سے رشتہ کا اظہار ہے جو اسلام اور عرب خون نے انہیں عطا کریں

مرتب

"...... میں مسلمان ہوں، ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ انہی دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں، کوئی اور ان پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ سلطانِ ٹرکی کو سلطان نہیں کہتے بلکہ اپنے ویران اور پتھریلے جزیرہ نما کا خادم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں، اونٹ چراتے ہیں، جو پر زندگی بسر کرتے ہیں، اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں، اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔

ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے۔ اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں، اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے۔ ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں، اس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اس کی جائیداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائیداد کیوں نہ کہ وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً" بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جاوے گی۔ پس میں دونوں طرح،

کیا بالحاظِ مذہب اور کیا بلحاظ خون کے ریڈیکل ہوں۔

لیکن ہمارا مذہب، جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کیے، اس نے اور باتیں بھی سکھائی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے، تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول، جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں، ان پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیے جبکہ زمانے کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو، نہ کہ اس حالت میں جبکہ زمانے کے حالات ان کے موافق نہ ہوں۔ مثلاً" جبکہ ان کے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آوے یا اس کو کمزور اور ضعیف کردے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کنسرویٹو ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل، سب اسی اصول کو قبول کریں گے...."

سرسید کا خط سیکرٹری برادر ھڈ کے نام

بخدمت جناب سیکرٹری صاحب ایم۔اے۔او کالج اسٹوڈنٹس برادر ھڈ

جناب من!

اگر آپ کے کالج کے پرنسپل یا اسکول کے ہیڈ ماسٹر مجھے کالج یا اسکول کی کسی کلاس کا طالب علم تسلیم کرلیں تو میں آپ کے ایم۔اے۔او کالج اسٹوڈنٹس برادر ہڈ میں داخل ہونا چاہتا ہوں اور اپنی پنشن میں سے ایک فیصدی دوں گا۔ میں آپ کی ایسوسی ایشن میں اجنبی بن کر داخل ہونا نہیں چاہتا، جیسا کہ آپ کے کالج میگزین کے آرٹیکل میں مذکور تھا۔ یعنی اس انجمن میں شرکت کا استحقاق حسب ذیل اشخاص کو ہو گا:

(الف) موجود طلباء مدرستہ العلوم مسلمانان۔
(ب) مدرستہ العلوم کے اسکول یا کالج کے پرانے طلباء۔
(ج) مدرستہ العلوم کے اسکول کے استاد۔

کیونکہ ایسا بے وقوف نہیں ہوں کہ ایک فیصدی چندہ تو دیتا رہوں اور برادری سے (یعنی اسٹوڈنٹس برادر ہڈ سے) خارج رہوں۔ (پس آپ) میرا خط برادر ہڈ کے جلسے میں پیش کریں اور

ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیں۔

آپ کا خیر خواہ

سید احمد

8 جون 1892ع

اس خط کے موصول ہونے پر برادر ہُڈ کی طرف سے سرسید کو یہ جواب بھیجا گیا

خط سیکرٹری برادر ہڈ بنام سرسید:

بخدمت جناب آنریبل ڈاکٹر سرسید احمد خاں بہادر کے - سی - ایس - آئی' ایل - ایل - ڈی۔
آنریبل قبلہ!

آپ کے برادر ہڈ میں داخل ہونے کی خواہش سے ہم کو نہایت خوشی اور شکر گزاری ہوئی۔ آپ کے کالج یا اسکول کے طالب علم ہونے کے متعلق ہیڈ ماسٹر صاحب اور پرنسپل صاحب سے دریافت کرنے پر نہایت دلچسپ بحث پیدا ہو گئی۔

پرنسپل صاحب فرماتے ہیں "آنریبل سرسید یقیناً" طالب علم ہیں' کیونکہ تمام عالم آدمی حقیقت میں طالب علم ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان معنوں میں وہ ایم - اے - او کالج کے نہایت لائق طالب علم ہیں اور کوئی کالج کا پروفیسر اس نام کا ان سے زیادہ مستحق نہیں ہے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب پرنسپل صاحب کے دعوے کی تردید کرتے ہیں اور آپ کو نہایت زبردست دلائل سے اسکول میں شامل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "پرنسپل صاحب کا بیان ہے کہ سرسید اس کالج کے طالب علم ہیں۔ یہاں تک میں تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ سرسید نے ابھی اس خوفناک دریا کو عبور نہیں کیا جسے انٹرنس اگزیمینیشن کہتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی کالج کلاس میں داخل نہیں ہو سکتے' اس لیے ضرور ہے کہ وہ اسکول کے طالب علم ہیں"

ہم جناب پرنسپل صاحب و ہیڈ ماسٹر صاحب کے نہایت مشکور ہیں کہ انھوں نے برادر ہڈ کے فائدے کی غرض سے آپ کو طالب علم بنالیا ہے۔ یعنی پرنسپل صاحب نے آپ کی اعلیٰ علمیت کے ذریعے سے اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے خوفناک دریا کے زور سے۔ لیکن ہمارے خیال میں ان پیچیدہ مسائل کی ضرورت نہیں' جب کہ ہم ایک قریب کے رستے سے آپ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم ایسے بے وقوف نہیں ہیں کہ بے باپ کے برادر ہُڈ قائم کر لیں۔ جب ہم نے برادر ہُڈ قائم کی' یا یوں کہیے کہ اپنے برادر ہڈ کی ہمیں کچھ سمجھ پڑی' اس وقت ہم اپنے والا قدر بابا سے

بے خبر نہ تھے۔ اس لیے اگر بھائیوں کی سوسائٹی میں باپ داخل ہو سکتا ہے تو آپ کو برادری سے خارج ہونے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔

دیگر یہ کہ بزرگان قوم کے متعلق ہماری برادرہُڈ ایسی تنگ ورز نہیں ہے کہ ہمارے حامیوں کی تعداد کے ساتھ اس کو وسعت نہ ہوتی جائے۔ برادرہڈ کے قواعد کے مطابق ایسے بزرگوں کو ہم بینیفیکٹرس آف دی برادرہُڈ (محسن الاخوان) کے نام سے یاد کریں گے۔ لیکن اگر یہ نام ان کو منظور نہ ہو تو ہم زمرۂ عمان، مجلسِ عم زادگان وغیرہ وغیرہ کے نام تجویز کرلیں گے یا سب کو برادر ہڈ میں ملالیں گے اور عمر یا رتبے کا لحاظ نہ کریں گے۔

کیونکہ ہم نے اپنے برادرہڈ کی بنیاد آیۂ کریمہ انما المومنون اخوۃ پر رکھی ہے۔

آخر میں ہم اپنی گزارشوں کا اعادہ کرتے ہیں، کیونکہ آپ نے ہماری ضعیف جماعت میں شامل ہو کر ہماری جرات بڑھادی ہے۔

آپ کی بقائے حیات کے دعاگو
آپ کے خاکسار بچے
ممبرز آف دی برادرہڈ

جب یہ تحریر سرسید کے پاس پہنچی تو انہوں نے اس کا یہ جواب دیا:

سرسید کا دوسرا خط سیکرٹری برادرہڈ کے نام:

بخدمت آنریری سیکرٹری مجلس الاخوان مدرستہ العلوم!

ڈیر سر!

آپ کی چھٹی مع ریمارکس پرنسپل وہورسٹ صاحب میرے پاس پہنچی۔ میں مسٹر بک اور مسٹر ہورسٹ اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ان ریمارکس کی نسبت جو آپ نے لکھے ہیں۔ لیکن جو اصلی بات لکھی ہے، وہ مسٹر ہورسٹ نے لکھی ہے اپنی چھٹی کے اخیر فقرے میں۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی نہایت عزت سمجھوں گا اگر آپ مسٹر ہورسٹ سے سفارش کر کے میرا نام اسکول کی نویں کلاس مین داخل کرا دیں اور میں آپ کی مجلس الاخوان میں شریک ہوں گا۔ صرف مسٹر ہورسٹ کی اتنی مہربانی چاہتا ہوں کہ حاضری سے مجھ کو معاف رکھیں، مگر میں برابر اس کلاس کی ٹیوشن فیس دیتا رہوں گا۔ اور میں دو روپے اس کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ ایک روپیہ فیس داخلہ اور ایک روپیہ جون کی ٹیوشن فیس۔ اگر ہورسٹ صاحب اس کو منظور کرلیں تو آپ میرا نام بھی مجلس الاخوان میں داخل کرلیجے۔ کاغذات جو آپ نے بھیجے ہیں وہ واپس کرتا

ہوں۔

آپ کا خادم

سید احمد

علی گڑھ، 11 جون 1892ء

سید احمد خاں ایم۔اے۔او۔ کالج کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ وہ اس کے طالب علم بھی تھے، اور اسٹوڈنٹس برادر ہڈ (مجلس اخوان) کے رکن بھی تھے۔ سرسید کس کس انداز سے سوچتے تھے اور ان کی محبت کتنی گہری تھی اس کا اندازہ ان تین خطوں سے ہو سکتا ہے۔ ان خطوں پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایک سمندر دل انسان کے جذبات کی موجیں ہیں۔ وہ جس کے جذبات میں بھی فکر نو کی نمود ہے

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

مرتب

بنام مولوی سید ممتاز علی

مولوی سید ممتاز علی انیسویں اور بیسویں صدی کے ممتاز اہل قلم اور ادبی صحافی تھے۔ "تہذیب النسواں" کے ذریعہ عورتوں کے مسائل پر توجہ دے کر قومی تحریک کی تکمیل کی۔ کتنی ہی مشہور خواتین کی ادبی زندگی کا آغاز اس رسالے سے ہوا۔ مولوی ممتاز علی کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ ان کی کتابوں میں حقوق نسواں' سبیل الرشاد اور شیخ حسن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی

سید ممتاز علی 1860ء میں پیدا ہوئے اور 1935ء میں انتقال ہوا۔ مشہور ادیب' اور ڈرامہ نویس سید امتیاز علی تاج آپ کے بیٹے تھے۔

سرسید' سید ممتاز علی سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی ادبی کاوشوں میں ان کے نگراں تھے۔

مرتب

محبی و مشفقی

مولوی محمد حسین صاحب کچھ ہی کہتے اور لکھتے ہوں' ہمارا اور ہمارے دوستوں کا طریقہ ان کے ساتھ اخلاق اور ادب کا رہنا چاہیے۔ وہ ذی علم اور قابل ادب ہیں اور کوئی ایسی بات جس سے ان کے دل کو رنج پہنچے' نہ ہونی چاہیے۔ ہمارا مشرب محبت ہے۔ ہمارے دل میں رنج کی جگہ ہی ہونی نہ چاہیے۔ تحریرات میں جو وہ بد تہذیبی کرتے ہیں اس سے ہمارا کیا نقصان ہے۔ بلکہ اگر افسوس ہے تو یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو بٹہ لگاتے ہیں۔

خاکسار

سید احمد

علی گڑھ' 20 مئی 1880ء

محبی و مشفقی!

عنایت نامہ پہنچا اور حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ آپ کی ملاقات کو دل چاہتا تھا۔ اس تعطیل میں نہ آنا بہتر ہوا۔ موسم اچھا نہیں ہے۔ تعطیل دسمبر میں ضرور تشریف لائیے گا۔ ملنے' بیٹھنے' باتیں کرنے' سیر کرنے' سب کے لیے اچھا موسم ہو گا۔ کیا عجب ہے کہ اس زمانے میں کوئی جلسہ کمیٹی کا بھی ہو۔

ہم ہندوستانیوں کی تمام مجلسیں بے جان ہیں۔ یا تو ان میں کچھ کام نہیں ہوتا یا کسی یورپین افسر کے ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں۔ یہ قوت ہم میں نہیں ہے کہ ہم اپنا کام اپنی رائے اور اپنی قوت سے چلاویں۔ ہم سے اور مسٹر کمیسن صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن سے نہایت ناموافقت تھی۔ ملاقات اور صاحب سلامت بھی نہ ہوتی۔ ہمارے تمام کاموں کے وہ برخلاف تھے۔ سبب صرف یہ تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ سیٹیفک سوسائٹی اور مدرستہ العلوم ان کے قبضے میں ہو اور ہم صرف ان کے ہاتھ میں بطور ایک آلہ کے ہوں۔ ہم نے (انہیں) نہایت استقلال سے کسی بات میں دخل نہیں دینے دیا اور خود آپ اور اپنی رائے سے اور اپنے مقاصد (کے لحاظ) سے کام چلایا اور میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرستہ العلوم کا جو کچھ حال ہو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ (مدرسہ) قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضے میں چلا جائے۔ بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔ لوگ عام فائدے کے کاموں میں حکام کے سامنے بھی اپنا رسوخ چاہتے ہیں' مگر حقیقت میں اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم اس ضلع کے حکام کا نہایت ادب کرتے ہیں۔ تمام جلسوں میں ان ہی کو افسر بناتے ہیں۔ انعام ان ہی کے ہاتھ سے تقسیم کراتے ہیں مگر ہمارے کام میں ان کو ایک نقطہ برابر بھی مداخلت نہ ہوئی۔ وہاں کے حالات نہایت افسوس کے قابل ہیں مگر "خود کردہ را درماں نیست"۔ جس کام سے قوم کا فائدہ متصور تھا اپنے ہاتھوں اس کو قوم کے لیے زہر بنالیا۔ ہمارا کالج فضل الٰہی سے نہایت ترقی پر ہے۔ مکانات کی نہایت قلت ہو گئی اس لیے داخلہ روک دیا گیا ورنہ اس وقت چار سو سے زیادہ طالب علم ہوتے۔ والسلام

خاکسار

سید احمد

علی گڑھ' 8 اگست 1881ء ع

مجی و مکرمی مولوی ممتاز علی صاحب۔

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ گو کہ بعض حالات رنج دہ اس میں لکھے ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کو کسی قدر صحت ہے اور نیز خدا نے گھوڑے پر سے گرنے کے صدمے سے بچالیا۔

جب مجھے آپ کے دوبارہ بیمار ہونے اور سہارن پور جانے کی خبر ملی تو مجھے نہایت رنج و تردد ہوا۔ زیادہ خیال اس بات کا تھا کہ میں کیا کروں اور کیا لکھوں۔ کسی طرف رائے قرار نہیں پاتی تھی۔ قبل عود مرض یقین تھا کہ آپ علی گڑھ میں آکر ایک مدت رہیں گے۔ اس یقین نے اور بیماری کے عود کرنے کی خبر نے حیران کر دیا تھا۔ اخیر رائے یہ قرار پائی کہ بعد جلسہ کانفرنس میں ایک دن کے لیے سہارن پور آکر تم سے ملوں اور اصلی حالات اور تمہاری مرضی اور خوشی دریافت کروں۔ یہ میرے خیالات تھے کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ مولوی سید عبداللہ صاحب سے تو آپ کا دور کا رشتہ ہے۔ مگر مجھ سے اور آپ سے روحانی رشتہ ہے' جو تمام رشتوں سے زیادہ اقرب ہے۔ پس جو کچھ مجھ سے آپ کی خدمت تیمارداری ہو سکے گی۔ میں اس کو اسی طرح ادا کروں گا جو روحانی رشتے کا مقتضا ہے۔

میرا خیال ہے کہ تم کو کچھ بیماری نہیں ہے۔ دل پر بسبب کمزوری کے کچھ خیالات جم گئے ہیں جو ملول اور افسردہ کرتے ہیں اور طاقت آنے نہیں دیتے۔ اس کا سب سے بڑا علاج دل کا خوش رکھنا ہے۔

امید ہے کہ میرے پاس رہنے سے تمہارا دل خوش رہے گا اور سب توہمات دور ہو جاویں گے۔ میری کوٹھی ظاہراً" خوش فضا ہے۔ ہمیشہ دو کمرے عمدہ معہ تمام ضروریات متعلقہ کے خالی رہتے ہیں۔ سب چیز تمہارے آرام کی موجود ہے۔ خانساماں جو ہوشیار آدمی ہے' موجود ہے۔ گائے میرے ہاں موجود ہے۔ ہر وقت تازہ دودھ موجود ہے۔ تازہ انڈا موجود رہتا ہے۔ خانساماں نہایت عمدہ سوپ جس قسم کا چاہو بناتا ہے۔ وقت معین پر جیسی مرضی ہو کھانا تیار موجود ملے گا۔ دو وقت ہوا خوری کو گاڑی جوڑی بھی موجود ہے۔ کرایہ پر منگانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ بعض میرے نہایت دلی دوست خصوصاً" مولوی زین العابدین میرے مکان کے نہایت متصل رہتے ہیں۔ آپ ان سے مل کر نہایت خوش ہوں گے اور آپ کا دل خوش رہے گا۔ مولوی محمد شبلی صاحب بھی اسی طرح قریب رہتے ہیں۔ مدرسہ میرے مکان سے نہایت قریب ہے۔ غرضکہ ہر طرح دل بہلا رہنے کا موقع ہے اور خدمت گاروں کا آپ کے ساتھ آنا مناسب ہے۔ ان کو اپنی خوراک کا انتظام کرنا ہرگز ضرور نہیں ہے۔ جس طرح میرے خدمت گار رہتے ہیں اسی

طرح وہ بھی رہیں گے۔ غرضکہ آپ علی گڑھ کو بلا تکلف اپنا گھر سمجھیں گے اور کسی قسم کا خیال دل میں نہ لاویں گے۔ میں علی گڑھ میں موجود ہوں یا بسبب ضرورتوں کے الہ آباد یا کہیں اور جاؤں، آپ کے آرام اور آسائش اور تمام چیزوں کے مہیا ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں ہونے کا۔

یہاں سول سرجن موجود ہے۔ مجھ سے ملاقات بھی ہے۔ چند ہفتہ سے یہاں آیا ہے۔ ظاہراً خوش مزاج بھی ہے اور یقین ہے کہ اپنے فن میں دستگاہ رکھتا ہو گا۔ علاوہ اس کے سنتا ہوں کہ اسٹنٹ سول سرجن جو یہاں ہے وہ بھی ہوشیار ہے۔ ایک آرام یہ ہے کہ مدرسے میں ہندوستانی ڈاکٹر ہے اور سب دوائیں موجود رہتی ہیں اور نہایت دھیان سے دوائیں تیار ہو کر مل سکتی ہیں۔ قیمت ان کی دے دی جاتی ہے جو مدرسے میں بحساب شفاخانہ جمع ہو جاتی ہے۔ میں بھی اسی طرح کرتا ہوں اور سوائے بورڈوں کے کالج افسر بھی جب دوا لیتے ہیں اسی طرح کرتے ہیں۔

اس وقت صرف اس قدر دقت ہے کہ بسبب جلسہ کانفرنس اور سالانہ جلسہ ٹرسٹیان کے بہت سے لوگ آنے والے ہیں اور دو انگریز بھی آویں گے، جو میری کوٹھی میں دو دن ٹھہریں گے۔ میں بھی اپنی کوٹھی کو چھوڑ دوں گا اور چار پانچ دن مدرسہ کے احاطے میں ڈیرے میں رہوں گا۔ پس اگر آپ قبل اختتام جلسہ کانفرنس تشریف لاویں تو چار پانچ دن میرے ساتھ ڈیرے میں رہنا ہو گا۔ اور بجز ڈیرے میں رہنے کے آپ کے اور کسی اوقات میں اور غذا میں کچھ فرق نہیں ہونے کا۔ سب بدستور مہیا و موجود ہوگی۔ پس اگر چار پانچ دن ڈیرھے میں رہنے سے آپ اپنی طبیعت پر کچھ ہرج نہ تصور فرماویں تو آپ فی الفور یہاں چلے آویں۔ اور اگر ڈیرے میں رہنا طبیعت پر کچھ ہرج ڈالے تو آپ 30 تا 31 دسمبر کو یعنی بعد اختتام جلسہ تشریف لاویں۔ اس وقت تک جو مہمان کوٹھی میں ٹھہریں گے، چلے جاویں گے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ڈیرے میں رہنے اور کانفرنس کے جلسہ کے قریب رہنے سے آپ کی طبیعت بہلی رہے گی۔

خاکسار

سید احمد

علی گڑھ 18 دسمبر 1891ء

مجی و مشفقی مولوی ممتاز علی صاحب!

آپ کا ایک لمبا پرائیویٹ خط کئی دن سے میرے سامنے رکھا ہوا ہے۔ میں اس کے جواب لکھنے کی فرصت ڈھونڈ رہا تھا۔ اس وقت اس کا جواب لکھتا ہوں۔ میری نہایت دلی آرزو ہے کہ عورات کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاوے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے۔ کنواری لڑکیاں تمام عمر بے شادی کے بلحاظ حالات کے نہیں رہ سکتیں اور نہ ان کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ پس ضرور ان کی شادی کرنی ہو گی۔ ہماری قوم کے لڑکوں کی جو ابتر و خراب حالت ہے اور (جو) بد عادتیں اور بد افعال ان کے ہیں اور بد اخلاق اور بد طریقہ ان کا اپنی جوروؤں کے ساتھ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس وقت تمام اشراف خاندانوں میں ایک لڑکا بھی نیک چلن اور خوش اخلاق، مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں نکلنے کا جو اپنی جورو کو ایک انیس غم گسار سمجھے۔

کل خاندان کے لڑکوں کا یہ حال ہے۔ جوروؤں کو لونڈیوں سے بدتر سمجھتے ہیں اور کوئی بداخلاقی ایسی نہیں جو جوروؤں کے ساتھ نہیں برتے۔ اب خیال کرو بے تربیت لڑکی پر یہ مصیبت صرف ایک حصہ ہے۔ اس کے خود خیالات عمدہ و تہذیب کے نہیں ہیں۔ اس کو اپنے خاوند کی بد اخلاقی صرف بقدر ایک حصہ کے رنج و مصیبت میں رکھتی ہے۔ اور جب کہ وہ اپنے تمام ہم سروں کا یہ ہی حال دیکھتی ہے تو کسی قدر تسلی پاتی ہے اور اس کے ماں باپ جب اس کی حمایت کرتے ہیں تو اس کے دل کو زیادہ تشفی ہوتی ہے۔ مگر جب وہ خود شائستہ و مہذب و تربیت یافتہ اور عالی خیال ہو تو یہ تمام صدمات اس کی روح کو بہت زیادہ رنج دیتے ہیں اور اس کی زندگی بلائے جان ہو جاتی ہے۔ عورات کی تعلیم، قبل مہذب ہونے مردوں کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لیے آفت بے درماں ہے۔

خاکسار

سید احمد

درسِ کتاب زندگی

آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے' نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے' نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے' بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پرکار اور مجسم ہیں' مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔

دین و دنیا

دین اور دنیا کا عجیب رشتہ ہے۔ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا رہتا ہے۔

اپنا گھر بننے دیجئے

آپ مجھ کو اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کے مانند تصور کیجئے اور میری محنت و مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے

قوم عزت اور تعلیم

عمدہ تعلیم و تربیت ہی قومی عزت اور قومی ترقی کا اصل ذریعہ ہے۔

فاش میں گویم

فاش میں گویم راز گفتہ خود دل شادوم
بندہ عشقم واز ہر دو جہاں آزادوم

میرے پھول

مجھے سب سے زیادہ ان پھولوں کے دیکھنے سے خوشی ہوتی ہے جو ہمارے کالج کے یہاں اس وقت کھل رہے ہیں۔ یہ پھول میری زندگی کی بہار ہیں' یہی میرے گل ولالہ ہیں اور یہی میری زندگی کی امیدیں ہیں۔

Rs. 160/=

ISBN 969-441-047-9